ماہنامہ

المبشر

اداریہ

ربیع الاوّل کے مہینہ کو حضورِ اکرم نبی خاتم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت سے شرف حاصل ہے ربیع الاوّل کے مہینہ اور دو شنبہ کے دن میں تو سب کو اتفاق ہے لیکن تاریخوں کے تعیین میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور ربیع الاوّل عوام میں زیادہ مشہور ہو گئی ہے جبکہ محققین کے نزدیک ۹ ربیع الاوّل پر زیادہ اتفاق ہے۔

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت، آپؐ وجود باوجود، اور آپ کی بعثت کا تذکار مبارک ایک ایسی سعادت ہے کہ جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں فرحت پیدا ہوتی ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کے تذکار مبارک کو رفعت و عظمت عطا فرمائی ہے۔

ورفعنا لك ذكرك — یہ تذکار مبارک آپؐ کے اخلاق کریمانہ، اوصاف حمیدہ اور اُسوۂ حسنہ کی بلندی اور پاکیزگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی عملی تعبیریں اور مثالیں اتنی دنیا تک آپؐ کی اُمّت میں پائی جاتی رہیں گی اور ایسے لوگوں کا وجود مسعود رہے گا کہ جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے اور جنہیں دیکھتے ہی صحابہؓ کی یاد تازہ ہو اور جن کی سرشار صورت سے حضور کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی برکات و فیضان محسوس و مشہور ہوں۔ دراصل آپؐ کے ذکرِ خیر کو دنیا میں بلند کرنے کی پسندیدہ صورت یہی ہے اور محبت کا اقتضاء بھی یہی ہے کہ محبوب کی اطاعت کی جائے اور یہاں تو محبت و اطاعت دونوں ضروری ہیں اگر کسی پہلو میں کمی رہ گئی تو بات نہیں بنے گی۔

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ یثرب کی عزت پر — خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان نہیں ہو سکتا

ایمان تکمیل کے لئے آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا حق ادا کرنا ہوتا ہے یعنی اپنی جان، مال و متاع، اعزّا و اقارب غرضیکہ ہر چیز سے زیادہ آپؐ ہو گی۔ محبت دل میں ہو اور ہر تقاضا ہر خواہش اور ہر تمنّا آپ کی محبت کے تحت آپ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل جائے، تاکہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے اختیار یہ اظہار ہو کہ یہ ہیں اُمّتِ مسلمہ کے افراد۔ محض غیروں کے رسم و رواج اور اہلِ دنیا کے طور طریقوں سے کبھی کوئی دن مناتا اور پھر اُسے طرح طرح کی بوالعجبیوں کا مجموعہ بنا دیتا۔ اسلامی مزاج اور شائستگی کے مناسب نظر نہیں آتا، محبت ضروری بھی ہے اور اہم بھی مگر آدابِ محبت کی رعایت اس سے بھی زیادہ اہم ہے یہ معاملہ بڑا نازک ہے اگر اس میں ذرا بھی لغزش ہوئی تو پھر خیر نہیں، اس بارگاہِ محبت میں آداب کی کچھ ایسی جوت ہے کہ:

نقش گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حضور کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تذکارِ خیر کی برکات و فیوض سے نوازے، آپؐ کی سُنّت تائید اور اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اس خلقِ عظیم کے سانچے میں ڈھال دے۔

مولانا محمد اکرم ملک

اسرار التنزیل

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الٓمٓ ۔ ذٰلِکَ الکتاب لا ریب فیہ .... ولھم عذاب عظیم ۔

"الٓمٓ ۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں ، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو ، جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو ، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُن کو اُس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے اُس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اُس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے ، اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں ، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے ، بے شک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہ لائیں گے مُہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے ۔"

یہ سورۃ (البقرہ) یہ سورۃ باعتبار نزول کے مدنی ہے اور بعض آیات واحکام نزولِ قرآن کے بالکل آخری دور کے ہیں ۔ مگر بلحاظ ترتیب پہلی سورۃ ہے ، سورۃ فاتحہ میں جو دعا ہدایت اور صراطِ مستقیم کے لئے کی گئی تھی اس کا جواب ہی قرآن کریم ہے ، چونکہ مدینہ منورہ کی زندگی میں مکہ مکرمہ کی نسبت ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا کہ وہاں مخاطب مشرکین وکفار تھے مگر یہاں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے کو "مسلم" اور اللہ کا مقرب جانتے تھے اور سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حقیقی پیروکار ہونے کے مدعی بھی تھے ۔ اور حقیقت یہ تھی کہ امتدادِ زمانہ سے انہوں نے تعلیمات موسیٰ کو نہ صرف فراموش کر دیا تھا بلکہ کتب الٰہی کو تحریف سے بھر دیا تھا اور عبادات کی جگہ رسومات نے اور ایمانیات کی جگہ خرافات نے لے لی تھی اور بایں ہمہ اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا ———

قرآن کریم نے سب سے پہلے ایمان اور کفر کو واضح کر دیا لہٰذا سب سے پہلے جو بات اس کتاب کے بارے میں ارشاد ہوئی اور جو ایمان کی بنیاد ہے وہ یہ ہے الٓمٓ ذٰلک الکتاب

لاریب فیہ (الٓمٓ). یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک (ریب نہیں) الٓمٓ. الف. لام. میم. حروف مقطعات ہیں، جو قرآن کریم کی اکثر سورتوں کی ابتداء میں نازل ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری اور معانی میں الجھنا غیر ضروری ہے کیونکہ "انہا سر بین اللہ و رسولہ" (یہ اللہ اور اس کے رسول کے مابین اسرار ہیں) یہ ایسی کتاب ہے جس میں ادنیٰ درجہ کے شبہ کی بھی گنجائش نہیں، یعنی اس کتاب سے جو موجب دعا، ہے استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ اے مخاطب! تو اس کے کسی مضمون یا کسی خبر جو گذشتہ یا آئندہ کے بارے میں ہو، یا کسی بھی بیان میں ادنیٰ سا شبہ بھی کبھی نہ رکھ کہ واقعتاً کسی شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ —— اکثر جو کتابیں ایسے مضامین پر مشتمل ہوں جو ماوراء الطبیعاتی ہوں یا ایسے ایسے حقائق سے بحث کرتی ہوں جو حواس کے ادراک سے بالاتر ہوں تو خود ان کے مصنفین کو بھی یقین کامل حاصل نہیں ہوتا کہ ساری بات کی بنیاد گمان (ظن و تخمین) پر استوار ہوتی ہے مگر اس کتاب کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کا نازل کرنے والا اللہ جل جلالہٗ ہے جس کا علم قدیم ہے، ازلی و ابدی ہے کامل و مکمل ہے ذاتی اور حضوری ہے سو اس کی بیان کردہ حقیقتیں شک و شبہ کی رسائی سے بہت بالا ہیں پھر تفہیماً اس رفع شک کے لئے اللہ کریم نے ان تمام واسطوں اور ذریعوں کی صداقت کی گواہی دی۔ ہے جو انسانوں تک اس کے پہنچنے کا سبب ہے۔ سب سے پہلا واسطہ اور سبب وہ فرشتہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اس کے پہنچانے کا ذریعہ ہے اللہ کریم نے فرمایا ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین، کہ وہ بہت طاقتور، اللہ کے نزدیک بہت معزز، تمام فرشتوں کا سردار اور بہت امانت دار ہے۔

ایسا طاقتور کہ کوئی بھی اپنی طاقت سے اس سے وحی چھین نہیں سکتا یا جبراً اس کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ بات میں کسی طرح کی آمیزش کرے۔ اور اگرچہ فرشتے نوری مخلوق ہیں مگر ان میں بھی عام و خاص تو ضرور ہیں تو یہ کوئی عام سا فرشتہ بھی تو نہیں بلکہ مطاع ایسا فرشتہ جس کی سارے فرشتے بھی اطاعت کرتے ہیں گویا فرشتوں کا سردار اور عند اللہ بہت معزز اور بزرگی کا حامل ہے پھر ایسا امانت دار کہ جس کی امانت و دیانت پر اللہ خود گواہ ہے یعنی اللہ کی کتاب کو اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچانے کا سبب ایک ایسا فرشتہ ہے جو انتہائی قوی، معزز اور امین ہے۔

(۲) دوسرا واسطہ اللہ سے مخلوق تک اللہ کا رسول ﷺ ہے جو صدق مجسم ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی صداقت پہ نہ صرف قرآن گواہ ہے بلکہ جس کی امانت پر اس کے بدترین دشمن یعنی مشرکین مکہ بھی گواہ ہیں جو اسے صادق اور امین کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کی بے داغ زندگی، سیرت مقدسہ اس کی نبوت پہ سب سے بڑی شہادت ہے، جہاں معجزات قاہرہ اور دلائل باہرہ اس کی نبوت کا ثبوت ہیں۔ اس کی قبل بعثت کی زندگی بھی اتنی طیب و طاہر

پاک صاف اور ایسی بے داغ ہے کہ کبھی کسی بھی طرح سے جھوٹ یا غلط بیانی کا شائبہ تک بھی نہیں پایا جا سکتا، بلکہ اس حیاتِ طیبہ کو تمام دلائلِ نبوت پر ایک تفوّق حاصل ہے لبثت فیکم من عمری. یعنی میں نے تمہارے درمیان ایک حیات بسر کی ہے کیا تم مجھ پر غلط بیانی کا الزام بھی لگا سکتے ہو حتیٰ کہ اس حیاتِ طیبہ کی اللہ کریم نے قسم کھائی ہے. لعمرک. یعنی تیری زندگی کی قسم —— تیری زندگی گواہ ہے سبحان اللہ! اور فرمایا انک لعلی خلق عظیم، تیرے اخلاق ان بلندیوں کو چھو رہے ہیں جو بشریت کی رسائی کی حد ہے. حاصلِ کلام، اللہ کریم سچا، اس کا پیغام لانے فرشتہ شک سے بالاتر، اور اس کا رسول صادق و مصدوق، یہ ساری بنیاد راستی سچائی اور حق ہے، لاریب فیہ — مگر کیا کیا جائے کہ ساری مخلوق کو یہ واسطہ بھی براہِ راست نصیب نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان ایک پورے طبقہ کا واسطہ ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست کلامِ باری کو سنا، سمجھا، سیکھا اور ساری خدائی تک پہنچایا. اگر خدانخواستہ یہ واسطہ اور ذریعہ ہی مجروح قرار پائے تو پھر بھی لاریب فیہ ثابت نہ ہو سکے گا، فرشتے اور رسول اللہ پر کسی بدنیت کو حملہ کرنے کی جرأت کم ہو گی مگر صحابہؓ چونکہ وہ درجہ معصومیت نہیں رکھتے تو معترضین کو یہاں حملہ کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہو گا. اور اگر بفرضِ محال کوئی اعتراض نہ بھی کرے اور واقعتاً وہ لوگ غلط بیانی کر جائیں تو کیا ہو؟ —— یہی کہ دین کی ساری عمارت مشکوک قرار پائے، تو اللہ تعالیٰ نے جو علیم بذات الصدور ہے اپنی کتاب میں سب سے زیادہ احوال ان حضرات کے ارشاد فرمائے، قرآنِ کریم کو جگہ جگہ ان کی مدح سے مزین فرمایا یہاں تک کہ ان کا ایمان مثالی ایمان قرار پایا "فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا" اور ان کے قلوب مثالی قلوب یعنی اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقویٰ اور ان کی صداقت مثالی صداقت اولئک ھم الصادقون، اور ان کی زندگی قابلِ اتباع بلکہ واجب الاتباع قرار دے دی والذین اتبعوھم باحسان.

یہ نہ صرف ان کے حالات کا مشاہدہ قرار دیا بلکہ فرمایا میرے علمِ ازلی میں یہ بات موجود تھی اور میں نے ان کی پیدائش سے پیشتر تورات و انجیل میں ان کے اوصاف ارشاد فرما دیئے تھے کہ یہ میری مثالی مخلوق ہو گی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی ان کا مثل نہ چشمِ فلک ان سے پہلے پائے گی اور نہ ان کے بعد دیکھ سکے گی اور واقعی یہ ضروری تھا کہ قیامت تک باقی رہنے والے دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے لے کر اقوامِ عالم بلکہ ساری انسانیت تک پہنچانے والے لوگ ایسے ہی مثالی کردار کے حامل ہونے چاہئیں تھے، جن کی ہر کوشش دین کے لئے اور ہر محنت دین کی خاطر ہو، اور حق تو یہ ہے کہ نہ صرف مکہ و مدینہ منورہ کی زندگی، نہ صرف روم و ایران کی جنگوں میں، نہ صرف قیصر و کسریٰ کے مقابلے میں صحابہؓ نے دین کی حفاظت کا حق ادا فرمایا بلکہ آج بھی

ان ہی کی ذواتِ مقدسہ اس بارگاہ کی پہرہ دار ہیں اور آج بھی ان کو ہٹا دیا جائے تو دین مخلوق تک پہنچ ہی نہیں سکتا، وہ لسانِ نبوت ہیں، ترجمانِ نبوت ہیں۔ انہوں نے قرآن کو براہِ راست حضورؐ سے سُنا، سیکھا، سمجھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس پر عمل کر کے اپنے عمل کی صحت کی سند حاصل کی، صدیاں بیت گئیں، کفر کے ظلمت کدے سے اٹھنے والی ہر لہر ان سے جا ٹکرائی مگر ہمیشہ کی طرح اپنا سر پاش پاش لے کر پھر انہیں اندھیروں میں گم ہو گئی ـــــ غیروں پہ کیا روش بعض ناداں دوستوں نے بھی ان مقدس ہستیوں پر مقدمہ چلانا چاہا، ذرا انصاف کو دیکھئے واقدی اور کلبی گواہ ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم معاذ اللہ مجرم، اور آج کے بزعم خویش ( ) محققین منصف! کیا کہنا ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

مگر ان سب کے باوجود ان کی شان ویسی کی ویسی بے داغ ہے کہ خود قرآن کریم کی لازوال شہادتیں کسی کا کچھ بس نہیں چلنے دیتیں، جب یہاں تک بات پہنچ گئی تو بے شک ثابت ہوا لاریب فیہ، عظمتِ صحابیت پہ یہ لاریب گواہ ہے اور اس بات کا واضح ثبوت کہ مقامِ صحابیت بجائے خود ایک خصوصیت کا حامل ہے جو بجز صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیب نہیں ہو سکتی اور یہ کہنا کہ الصحابۃ کلھم عدول کا کلیہ صرف احکام دین پہنچانے کی حد تک درست ہے ذاتی زندگی میں ان کا صالح ہونا اس سے ثابت نہیں، عقل و دیانت کا منہ چڑاتا ہے یہ بات عقلِ سلیم تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک شخص بیک وقت بدکار بھی ہو اور راست باز بھی، پھر راست باز بھی ایسا کہ اللہ کا آخری کلام اللہ کی مخلوق تک پہنچانے کا ذمہ دار قرار پائے، معترضین کو حضرت ماعزؓ کی حکایت بطور ثبوت مل گئی مگر کاش اسے صحابہؓ پہ تنقید کی بجائے ان کی مثالی توبہ کے حوالے سے مدحِ صحابہؓ میں بیان کیا جاتا، جو اس کا اصلی مقام تھا ـــــ صحتِ دین اور حقانیت دین کے زندہ ثبوت یہی معزز، مقدس اور بزرگ ہستیاں ہیں،

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ راہ دکھاتی ہے ڈرنے والوں کو یعنی یہ رہبری کرتا ہے ان لوگوں کی جو متقی ہوں، ہدایت رہنمائی کے معنوں میں تو ساری دنیا کے لئے ہے کیونکہ دعوت الی الحق تو پوری انسانیت کے لئے ہے۔ مگر رہبری صرف ایسے لوگوں کے لئے ہے جو اپنے اندر اس کے ساتھ چلنے کی استطاعت پیدا کر لیں یہ قوت ہے تقویٰ، جس کا اُردو ترجمہ عام طور پہ لفظ "ڈر" سے کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ اس کی مراد کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس کا اصل مقصد ایک خاص ڈر ہے جو کسی محبوب ہستی کی ناراضگی کا ڈر ہو، جو کسی کے روٹھ جانے کا اندیشہ ہو، جو ہر حال کسی پہ نثار ہونے کی تمنا ہو، یہ وہ جذبہ ہے جو تمام خواہشات اور ارادوں کو تمام آراء اور مشوروں کو صرف اس وجہ سے روک دے کہ ایسا کرنے سے میرا رب مجھ سے خفا

نہ ہو جائے اور اگر بمقتضائے بشریت غلطی صادر ہو جائے تو احساس گناہ دل میں کانٹے کی طرح چبھتا اور توبہ پر مجبور کر دیتا ہے یہ تقویٰ ہے ولم یصروا علی ما فعلوا حصولِ تقویٰ کے لئے کونسا راستہ ہے اور متقیوں میں کیا اوصاف پائے جاتے ہیں ارشاد باری ہے اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں) سب سے پہلی بات ایمان بالغیب ہے کہ ایسے لوگ جو ان تمام باتوں پر جو حواسِ انسانی کی رسائی سے باہر ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں سب سے بڑا غیب خود ذاتِ باری ہے جس کی قدرت اُس کی تخلیق سے تو ہویدا ہے مگر جو نہ نظر آتا ہے نہ جس کی کوئی مثال بیان کی جا سکتی ہے پھر تمام حقائق اُخرویہ، دوزخ، جنت، برزخ، عذاب و ثواب قبر، سوال و جواب، رُوح، حشر و نشر، فرشتے، لوح محفوظ، غرض ہر وہ شے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے مگر حواسِ انسانی مادی کے ادراک سے بالاتر ہے اسے صدقِ دل سے مانتے ہیں اور یہ ماننا صرف اعتماد علی الرسول پر منحصر ہے ورنہ کوئی حیلہ عقلی وہاں تک رسائی نہیں رکھتا، آج کے دَور میں چونکہ اس اعتماد میں بہت کمی آگئی ہے، ایک طویل دَور درمیان میں حائل ہے اور بقولِ شاعر ؎

دخل الزمان بنا و فرق بیننا
ان الزمان مفرق الاحباب

(زمانہ ہمارے درمیان در آیا اور ہمیں جدا کر دیا بے شک زمانہ دوستوں کو جُدا کرنے والا ہے)

اس درازیٔ مدت نے اور نئی روشنی کے اندھیروں نے آج کے مسلمان سے وہ دور چھین لیا ہے جو قربِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دل میں پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی عقلی دلیل کے سب سے بڑی دلیل پر اعتبار کرا دیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرما دینا سب سے بڑا ثبوت ہے اور بس، اس ساری حقیقت پہ ایمان انسان کو مجبور کر دیتا ہے کہ عملی زندگی کو اس روش پہ ڈھالے جو قربِ الٰہی کا سبب ہو جس کا سب سے پہلا زینہ نماز ہے۔

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (اور وہ نماز کو قائم کرتے ہیں، اقامتِ صلوٰۃ صرف نماز کا پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا ایک خاص اہتمام کرنا ہے وقت جماعت مسجد کی حاضری کا احساس، ایک فکر جو ارکانِ وضو سے لے کر ارکانِ صلوٰۃ تک کارفرما ہو، اور پھر نہ صرف نماز ادا کرتا ہو بلکہ حقیقتاً تو اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ جہاں جہاں سے گذرتا جائے وہاں کے لوگوں کو بھی نمازی بنایا جائے تب لطف ہے نماز قائم کرنے کا، مگر یہ ماشاءاللہ کا مقام نہیں، کم از کم اپنی نماز کو صحیح وقت پر اور درست طریقے سے ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مولانا محمد منظور نعمانی

ذکر اللہ کی عظمت اور اسکی برکات

عن ابی ہریرۃ وابی سعید قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتهم الملئکة وغشيتهم الرحمة ونزلت ونزلت عليهم السكينة وذكرهم الله فيمن عندہ۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا، جب بھی اور جہاں بھی بیٹھ کے کچھ بندگانِ خدا اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر فرشتے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو گھیر لیتے ہیں اور رحمتِ الٰہی ان پر چھا جاتی ہے اور ان کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے اور ان پر سکینہ کی کیفیت نازل ہوتی ہے اور اللہ اپنے ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔

(صحیح مسلم)

"ذکر اللہ" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے نماز، تلاوت قرآن اور دعا و استغفار وغیرہ سب ہی کو شامل ہے اور یہ سب اسی کی خاص خاص شکلیں ہیں لیکن مخصوص عرف و اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس، توحید و تمجید اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی صفات کمال کے بیان اور دھیان کو "ذکر اللہ" کہا جاتا ہے۔

شیخ ابن القیمؒ نے مدارج السالکین میں ذکر اللہ کی عظمت و اہمیت اور اس کی برکات کے متعلق فرماتے ہیں — تمام اعمال صالحہ کی روح اور جان ذکر اللہ ہے اور یہی ذکر اور دل و زبان سے اللہ کی یاد پروانۂ ولایت ہے کہ جس کو عطا ہو گیا وہ واصل ہو گیا۔ اور جس کو عطا نہیں ہوا وہ دور اور مہجور رہا۔ یہ ذکر اللہ والوں کے قلوب کی غذا اور ذریعۂ حیات ہے اگر وہ ان کو نہ ملے تو جسم ان قلوب کے لئے قبور بن جائیں اور ذکر ہی سے دلوں کی دنیا کی آبادی ہے اگر دلوں کی دنیا اس سے خالی ہو جائے تو بالکل ویرانہ ہو کر رہ جائے اور ذکر ہی ان کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ روحانیت کے رہزنوں سے جنگ کرتے ہیں اور وہی ان کے لئے ٹھنڈا پانی ہے جس سے وہ اپنے باطن کی آگ بجھاتے ہیں اور وہی ان کی بیماریوں کی دوا ہے کہ اگر ان کو نہ ملے تو ان کے دل گرنے لگیں اور وہی وسیلۂ ربط ہے ان کے اور ان کے علام الغیوب رب کے درمیان — کیا خوب کہا گیا ہے ؎

اذا مرضنا تداوینا بذکرکم — فنترک الذکر احیانا فننتکس

جب ہم بیمار پڑ جاتے ہیں تو تمہاری یاد سے اپنا علاج کرتے ہیں اور جب کسی وقت یاد سے غافل ہو جائیں تو مرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح بینا آنکھوں کو روشنی اور بینائی سے منور کیا ہے اسی طرح ذکر کرنے والی زبانوں کو ذکر سے مزین فرمایا ہے (اور دلوں کو نور بخشا ہے) اللہ کی یاد سے غافل زبان اُس آنکھ کی طرح ہے جو بینائی سے محروم ہو اور اس کان کی طرح ہے جو شنوائی کی صلاحیت کھو چکا ہے اور اُس ہاتھ کی طرح ہے جو مفلوج ہو کر بیکار ہو گیا ہے۔

ذکر اللہ ہی وہ راستہ اور دروازہ ہے جو اللہ جل جلالہٗ اور اُس کے بندے کے درمیان کھلا ہوا ہے اور اس سے بندہ اسکی بارگاہِ عالی تک پہنچ سکتا اور جب بندہ اُس کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے

فنسیان ذکر اللہ موت قلوبھم
واجسامھم قبل القبور قبور،
وارواحھم فی وحشۃ من جسومھم
ولیس لھم حتی النشور نشور،

اللہ کی یاد سے غافل ہو جانا اور فراموش کر دینا ان کے قلوب کی موت ہے اور اُن کے جسم زمین والی قبروں سے پہلے اُن کے مُردہ دلوں کی قبریں ہیں —— اور ان کی روحیں سخت وحشت میں ہیں اُن کے جسموں سے اور اُن کے لئے قیامت اور حشر سے پہلے زندگی نہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ قلوب کو نورانی بنانے اور اوصاف رذیہ کو اوصافِ حمیدہ میں تبدیل کر دینے میں سب طاعات و عبادات سے زیادہ زود اثر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

حدیث مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کے ایک جگہ جمع ہو کر ذکر کرنے کی خاص برکات ہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں ——

"اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمانوں کا جمع ہو کر ذکر وغیرہ کرنا رحمت و سکینت اور قربِ ملائکہ کا خاص وسیلہ ہے"۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۷)

اس حدیث میں اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں کے لئے چار خاص نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے

ایک یہ کہ ہر طرف سے اللہ کے فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں دوسرے یہ کہ رحمت الٰہی ان کو اپنے آغوش اور سایہ میں لے لیتی ہیں اور ان دونوں نعمتوں کے لازمی نتیجہ کے طور پر تیسری نعمت ان کو یہ حاصل ہوتی ہے کہ ان کے قلب پر "سکینت" نازل ہوتی ہے جو عظیم ترین روحانی نعمتوں میں سے ہے —— یہاں سکینت سے مراد خاص درجہ کا قلبی اطمینان اور روحانی سکون ہے جو اللہ کے خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی عطیہ کے طور پر نصیب ہوتا ہے اسی کو "اہلِ سلوک" "جمعیتِ قلبی" بھی کہتے ہیں۔ اس

دولت اور نعمت کا صاحب سکینہ کو احساس اور شعور بھی ہوتا ہے ——— اور ذاکر بندوں کو ملنے والی چوتھی یہ نعمت جس کا اس حدیث میں سب سے آخر میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کے حلقہ میں ان ذاکر بندوں کا ذکر فرماتے ہیں کہ :-

دیکھو آدم ہی کی اولاد میں سے یہ بھی بندے ہیں جنہوں نے مجھے دیکھا نہیں غائبانہ ہی ایمان لائے ہیں، اس کے باوجود محبت وخشیت کی کیسی کیفیت اور کیسے ذوق وشوق اور کیسے سوز وگداز کے ساتھ میرا ذکر کر رہے ہیں۔ بلاشبہ مالک الملک کا اپنے مقرب فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کا اس طرح ذکر فرمانا وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملا کہ اگر اللہ کا کوئی ذاکر بندہ اپنے قلب وباطن میں "سکینت" کی کیفیت محسوس نہ کرے (جو ایک محسوس کی جانے والی چیز ہے) تو اس کو سمجھنا چاہیئے کہ ابھی وہ ذکر کے اُس مقام تک نہیں پہنچ سکا ہے جس پر یہ نعمتیں موعود ہیں یا اس کی زندگی میں کچھ ایسی خرابیاں ہیں جو آثارِ ذکر کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، بہر حال اسے اپنی اصلاح کی فکر کرنا چاہیئے، ربّ کریم کے وعدے برحق ہیں۔

ملفوظات طیبات :-
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ
تسوید :- مولانا محمد افضال الحق صاحب

سلوک و طریقت

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

میں سلوک و تصوف کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر ضعف کی وجہ سے آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "احسان" کی بہت تعریف کی ہے۔

انّ رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔ انّ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات اُولٰئک الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا ونتجاوز عن سیئاتھم۔ للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ۔ انّ اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔

اور بہت سی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے "احسان" اور "محسنین" کی تعریف فرمائی ہے جس سے "احسان" کا مقصود و مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کی اہمیت کے پیش نظر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جناب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام ایمان اور احسان کا سوال کیا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان کی تعریف فرمائی ہے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔ احسان یہ ہے کہ عبادت کی حالت میں خیال ایسا ہو کہ گویا اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، غلام جب اپنے آقا کو دیکھ کر کام کرتا ہے تو خشوع وخضوع کی کوئی حالت نہیں چھوڑتا جس کو اپنے اندر پیدا نہ کر لیتا ہوں، یہی حالت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہونی چاہیئے اسی کا نام "احسان" ہے اسی احسان کو حاصل کرنے کے لئے تصوف کے تمام کام کئے جاتے ہیں ہم عبادت کرتے ہیں تو زبان پر فاتحہ شریف اور کلام اللہ ہوتا ہے اور دل تجارت، اہل وعیال اور دنیاوی ضرورتوں میں لگا رہتا ہے یہ تو احسان نہ ہوا یہ تو غفلت ہوئی احسان تو اس طرح ہونا چاہیئے جس طرح مالک کے رُو برُو غلام رہتا ہے، یہ احسان حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے انسے حاصل کرنے کے لیے جو کام کئے جاتے ہیں اسے "سلوک" کہتے ہیں بحضرات صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں دو چیزیں مقصود ہوتی تھیں۔ ایک حضور مع اللہ اسی کو احسان کہتے ہیں، دوسری شکل وصورت اخلاق وعادات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سی ہونی چاہئیں متقدمین اخلاق وعادات کے درست کرنے کو مقدّم رکھتے تھے جس سے انسان کے دل سے ریا، سمعہ، کبر وبغض وغیرہ کو دُور کیا کرتے تھے، اس میں سال ہا سال

لگ جاتے تھے اس کے بعد حضور مع اللہ کی تعلیم دیا کرتے تھے اس میں عمریں لگ جاتی تھیں اور بسا اوقات حضور حاصل ہونے سے پہلے سالک کی زندگی ختم ہو جاتی تھی متاخرین کے احسان یعنی "حضور" کو مقدم رکھا ہے اسی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کے ساتھ ساتھ اخلاق کی وابستگی کی بھی کوشش ہوتی رہتی ہے اور خود حضور کی کیفیت سے آہستہ آہستہ اخلاق کی اصلاح ہوتی چلی جائے گی انہی کوششوں کا نام اب سلوک و تصوف پڑ گیا ہے دورِ صحابہ میں احسان کی کیفیت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صرف صحبت کی برکت سے حاصل ہوتی تھی آپ کے انوار سے دل کی گندگی دور ہو جاتی تھی اور حضور حاصل ہو جاتا تھا لیکن زمانہ جیسے جیسے گذرتا گیا محنت اور ریاضت کی ضرورت بڑھتی گئی غیر اللہ کا تعلق اور دنیا کی محبت کی وجہ سے جو میل کچیل دل میں بڑھ گیا اسے دور کرنا پڑا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ہر چیز کے صاف کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے جس سے اس کی گندگی اور زنگ دور کیا جاتا ہے اور دلوں کی صفائی کے لئے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اس ذکر سے دل کی صفائی کا جو کام کیا جاتا ہے اس سے "حضور" حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی کا نام "سلوک" ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ نقشبندیہ کے یہاں ذکر آہستہ آہستہ ہے قادریہ اور چشتیہ کے یہاں ذکر بالجہر ہے (ذکر جہری سے دل صاف ہو جاتا ہے) سہروردیہ کے یہاں وظائف و نوافل بہت ہیں وشاذلیہ درود شریف کی بہت کثرت پر زور دیتے ہیں مگر آخر میں سب ایک جگہ آکر جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ہے مراقبہ ذاتِ باری کا یعنی حضور و احسان حاصل ہو جائے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔ بہر حال دل کی صفائی کے جو طریقے ہیں وہ ہی سلوک ہیں۔

مراتبِ تصوف

سلوک و تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ احسان کا نام ہے جسے قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے۔ مشائخ کے نزدیک احسان کا کم از کم مرتبہ ملکۂ یاد داشت ہے یعنی دل میں اتنی قوت اور اتنا رسوخ پیدا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو سکے اس کے بھی مراتب ہیں بعض اس درجہ ترقی کر جاتے ہیں کہ کسی وقت اس کی یاد سے غافل نہیں ہوتے سوتے جاگتے، چلتے، پھرتے ہر حال میں یاد رکھتے ہیں الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم۔ یہ چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے ایسی حاصل ہو جاتی تھی کہ کہیں وہیں دنیا کے کسی کاروبار میں مشغول ہوں اس کی یاد سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ یاد دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک لفظ اللہ اللہ یعنی اسم ذات کی یاد لفظ اللہ الرحمٰن وغیرہ اسم ہے یہ کم مرتبہ کا ذکر ہے دوسرا ذکر مسمی کا ذکر ہے مسمی ذات مقدس ہے جو رزاق ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیا ہے ذات اور مسمی کا ذکر اصلی اور اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے جو بہت محنت سے حاصل ہوتا ہے جب قلب میں اس کا رسوخ پیدا ہو جاتا ہے تو اسے اجازت دے دی جاتی ہے میں آج مندرجہ فہرست ۱۰ اشخاص آسام کے ایک بخاری صاحب اور ۸ بہار کے لوگوں کو اجازت دیتا ہوں جنہوں نے محنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا ہے

مگر اس سے آدمی میں کبر اور گھمنڈ نہیں پیدا ہونا چاہیئے عبادت میں ہمیشہ کوشش کرتے رہنا چاہیئے جتنا بھی آگے بڑھے اتنا ہی ڈرنا ضروری ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اس کی رحمت مانگنی چاہیئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی تقدس کے باوجود سب سے زیادہ اللہ سے خوف کھایا کرتے تھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رات کے وقت تہجد پڑھتے ہیں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی آواز آتی تھی جیسے ہانڈی کے پکنے سے آتی ہے اس طرح حضورؐ راتوں کو رویا کرتے تھے کسی وقت مطمئن نہ ہونا چاہیئے ہر وقت ڈرنا چاہیئے جب تک ایمان پر خاتمہ نہ ہو جائے کسی کو حقارت سے نہ دیکھے سب سے مل جل کر رہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے یاد باری سے غافل نہ ہو۔

(بشکریہ انوار مدینہ، لاہور)

نورِ سحر

تبصرۂ کتب

نورِ سحر (ادبی مجلہ) ۱۹۸۰ء
گورنمنٹ کالج چشتیاں
پندرھویں صدی ہجری نمبر
ناشر: پروفیسر فضل احمد رانا پرنسپل
صفحات: ۲۷۵ آفسیٹ طباعت
سرورق: چہار رنگ

نورِ سحر گورنمنٹ ڈگری کالج چشتیاں کا ادبی مجلہ ہے! یقین نہیں آتا!! چشتیاں جیسے دُور افتادہ مقام اور صحیح معنوں میں پس ماندہ علاقے سے اتنا خوبصورت جامع اور پر مغز ادبی مجلہ کا منصۂ شہود پر آنا کچھ کم کرامت نہیں۔ پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات کا محور آج کل بڑے شہر ہیں۔ چھوٹے شہر اس سعادت سے قطعاً محروم نہیں۔ اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت چشتیاں کالج کا یہ مجلہ ہے

طلبہ اور اساتذہ کی نگارشات کا توازن بھی انتہائی خوبصورت ہے۔ تقریبات کے فوٹو کالج کی سرگرمیوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ کاش بڑے کالج بھی چشتیاں کالج کے میگزین کی روایت اپنا سکیں۔ کالج کے ارباب اختیار یہ کہتے ہیں کہ تیس برس پہلے جو فنڈ کی شرح تھی آج بھی وہی ہے۔ اس نے آج کل ان فنڈز کے ساتھ رسالہ ممکن نہیں اگر فنڈز کی شرح بڑھائی نہیں جا سکتی تو کیا بہتر ہو کہ محکمہ اطلاعات یا آڈٹ بیورو آف سرکولیشن ان ادبی مجلوں کو بھی سرکاری اور نیم سرکاری اشتہارات کا مناسب کوٹہ دے کہ ان کی مالی اعانت کرے تاکہ طلبہ صحت مند سرگرمیوں سے محروم نہ ہوں۔

لطیفۂ رُوح

جسمِ انسانی میں دل کا فعل دُرست ہو جائے تو صاف خُون وریدوں اور شریانوں میں گردش کرنے لگتا ہے اور باقی اعضائے رئیسہ پر بھی اس کا خوشگوار اثر ہوتا ہے گویا دل کی درستی بالواسطہ تمام اعضائے رئیسہ کی اصلاح کا سبب بنتی ہے اسی طرح سبب سالک کا لطیفۂ قلب منوّر ہو جائے باقی لطائف بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ فرمایا۔

ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد

کلہ و اذا فسدت فسد کلہ الا وھی القلب

او کما قال

قلب جاری ہونے کا مفہوم کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی چشمہ سے پانی جاری ہو جائے تو اس سے یہی مُراد ہوتی ہے پانی چشمہ سے نکل کر ڈھلوان کی طرف بہنا شروع ہو گیا۔ یہی جاری پانی ندی نالے دریا بنتا ہوا بالآخر سمندر میں پہنچ جاتا ہے جو اس کی آخری منزل ہے اسی طرح قلب جاری ہوا تو اس کے انوار اور اس کی آب و تاب نے باقی لطائف کو متاثر کیا اور سالک کی روح اپنی منزل یعنی قربِ الٰہی کی طرف پرواز کرنے لگی۔

لطیفۂ قلب کے جاری ہونے سے اس کا ہمسایہ دوسرا لطیفہ جسے رُوح کہتے ہیں لازماً متاثر ہوا۔ شیخ نے توجہ سے دوسرے لطیفہ کی تربیت شروع کر دی اور سالک دوسرے لطیفے کو منوّر کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اہلِ فن اس لطیفہ کی تربیت کے وقت کہتے ہیں۔ زیرِ قدم حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ ہے اس لطیفہ کے جاری اور راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض ان دو اولوالعزم پیغمبروں کے توسط سے سالک کو پہنچ رہا ہے۔ ان حضرات کی سیرت میں چند خصوصی پہلو ممتاز نظر آتے ہیں حضرت نوحؑ کی سعی مسلسل کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ۹۵۰ برس تک اپنی قوم کو دعوت الی اللہ دیتے رہے نہ تھکے نہ اکتائے نہ دعوت کا کام بند کیا۔ ظاہر ہے کہ بڑی کامیابی ہوئی ہو گی۔ کثیر التعداد لوگوں نے دعوت کو قبول کیا ہو گا۔ یہ بہار دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہوں گے اس لئے دعوت کا کام چھوڑ دینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ مگر حالات اس کے برعکس تھے۔ ۹۵۰ برس کے عرصہ میں صرف اتنے انسانوں نے ان کی بات پر کان دھرا جو ایک

کشتی میں آگئے۔ اندازہ کیجئے وہ کتنے ہوں گے۔ ایک سو سے زیادہ کیا ہو سکتے ہیں اگر یہی تعداد فرض کر لی جائے۔ تو ۹ آدمی سالانہ کے قریب بیٹھتے۔ غور کیجئے اللہ کا جلیل القدر پیغمبر سال بھر محنت کرتا ہے اور محنت بھی کیسی کہ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَھَارًا۔ کہ رات دن دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ کیا سامنے آتا ہے فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَائِیْ اِلَّا فِرَارًا۔ کہ میں جتنا بلاتا ہوں وہ اتنا دور بھاگتے ہیں جتنا کھینچتا ہوں وہ اتنے بدکتے ہیں جیسے طبیعات والے کہتے ہیں کہ

کو مقناطیس بنانے کی جتنی کوشش کی جائے اس کا اثر الٹا ہی ہوتا ہے اس المیہ کے باوجود حضرت نوحؑ نے دعوت و تبلیغ کا کام ترک نہیں کیا۔ آخر جب اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے معلوم کر لیا کہ یہ زمین بالکل بنجر ہے اور سانپ کے ہمیشہ سپولئے ہی پیدا ہوتے ہیں یہ جتنے بڑھیں گے زہر زیادہ پھیلے گا۔ تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا۔

یعنی الٰہی ان ظالموں کا نام و نشان تک نہ رہنے دے یہ خود جب تک جئے بغاوت ہی پھیلائیں گے اور ان سانپوں کے بچے یہی زہر لے کر پیدا ہوں گے اور تیری مخلوق کو ڈستے پھریں گے۔

اس سے سالک کو دو امور کی رہنمائی ملتی ہے اوّل یہ کہ جو دولت اسے ملی ہے اسے بانٹے مخلوق کو دعوت الی اللہ دے اور اس کام کو کوئی طاقت اور کوئی ناخوشگوار حالت روک نہ سکے۔ یہاں آدمی ایک غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی کوشش کا خاص نتیجہ پہلے ہی تصور میں رکھ لیتا ہے کہ میری دعوت یوں مقبول ہوگی۔ اتنے لوگ قبول کریں گے وغیرہ جب نتیجہ اس کے اندازے کے مطابق ظاہر نہیں ہوتا تو حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور کام چھوڑ دیتا ہے یہ بڑا خطرناک موڑ ہے اس پریشانی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی معاذ اللہ خدا بننا چاہتا ہے کیونکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو۔ اور یہ منصب صرف خدا کو سزاوار ہے کہ جو وہ چاہے وہی ہو۔ بندہ کا مقام یہ ہے کہ اپنی ڈیوٹی کرتا رہے نتیجہ اس کے حوالے کرے جو یہ سارا نظام چلا رہا ہے اور ہمیشہ یہ خیال رہے کہ نتیجہ وہی نکلے گا۔ جو وہ چاہے گا۔ آدمی جب اپنے دائرۂ عمل سے نکل کر خدا کے دائرۂ کار میں قدم رکھتا ہے تو اسے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا سالک کا کام ہے کہ نتیجہ سے بے نیاز ہو کر دعوت الی اللہ کا کام کرتا چلا جائے۔ ترکِ دعوت کا خیال بھی نہ آنے پائے۔ نتیجہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے توسط سے اُمت کو یہی تعلیم دی ہے کہ

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔

یعنی آپ اس فکر میں کیوں گھلے جا رہے ہیں، کہ یہ لوگ آپ کی بات کیوں نہیں مانتے پھر ہدایت و ضلالت کا راز بتاتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔

یعنی ہدایت دینا آپ کے دائرۂ عمل سے باہر ہے اس کا تعلق میری ذات سے ہے آپ کا کام بس دعوت دینے پہلے بتایا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سالک کو یہ دیکھ کر کہ حضرت نوحؑ نے آخر تنگ آکر باغیوں کو تباہ کرنے کی درخواست کر ہی دی۔ یہ سوچنا چاہیئے۔ یہ معاملہ ایک اولوالعزم پیغمبر کا ہے جسے رب العالمین سے براہِ راست حقائق منکشف ہوتے ہیں نبی خود نہیں کہتا بلکہ اس سے کہلوایا جاتا ہے۔ یہ منصب کسی غیر نبی کو حاصل نہیں جیسے آیت اأانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون کے نزول سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو آگاہ کر دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے آپ خواہ کتنی کوشش کر دیکھیں۔ علماء کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کو کچھ نہیں کہا اس سے پہلے آپ دیکھتے تھے۔ آپ کی دعوت کا اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا مگر برابر دعوت دیتے رہتے تھے۔ اس لئے سالک کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہ منصب صرف نبی کا ہے افراد اُمت کا کام یہ ہے کہ برابر دعوت الی اللہ دیتے ہی رہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب دعوت کے جواب میں انکار، ضد یا جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو حکمت تبلیغ کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو داعی حق حکمت تبلیغ سے کام نہیں لیتے وہ نہ صرف خود مایوس ہو کر اپنا کام بگاڑتے ہیں۔ بلکہ مخاطب کے اندر ضد اور ہٹ دھرمی کے جذبات کی پرورش کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لئے سالک کو اس خطرے سے آگاہ رہنا چاہیئے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ داعی اپنے مخاطب کو مریض سمجھے پھر سوچے کہ ایک معالج جسے صرف مریض کی خیر خواہی مطلب ہو علاج کے دوران مریض سے کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ بس وہی طرزِ عمل اختیار کرنا مناسب ہوتا ہے۔ جھگڑا مناظرہ یا فتویٰ سے دعوت و تبلیغ کا کام نہیں ہو سکتا۔

ایک مثال پیش کرتا ہوں فرض کیجئے آپ سے مطالبہ ہوتا ہے کہ فلاں جگہ بیان کرنا ذکر کی فضیلت بتاتی ہے اور ذکر کرانا سے کیونکہ کیونکہ وہاں ایک آدمی ہماری مخالفت پر تُلا ہوا ہے اور وہ مجلس کے خلاف تحریک چلانا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ اس مطالبے کے اندر خود ضد اور مخالفت کے جراثیم پائے جاتے ہیں اگر یہ مطالبہ پورا ہی کرنا ہو تو صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی بات پوری دلسوزی سے کہہ دے پھر دعوت دے کہ بھئی مجھے یہ کام مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے آپ گھر جا کر اس پر غور کریں اگر آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں تو بسم اللہ کر دیجئے اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ کام غیر مفید یا غیر ضروری ہے تو اس بات کو بھول جائیں کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ اور اس نے کوئی بات کہی تھی۔ اس طرح کا ایک تجربہ ہوا ہے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ وہ جسے ہم مخالف سمجھتے تھے وہ برابر بیٹھا بات سنتا رہا اور وقتاً فوقتاً اسے آبدیدہ ہوتے بھی دیکھا پھر بیان کے بعد مجلسِ ذکر ہوئی تو وہ ذکر میں بھی شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے ایک پل میں دل پھیر دیتا ہے اس لئے دعوت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ میری باتوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ بس تُو اپنی قدرت سے دلوں کو اپنی طرف پھیر دے۔

حضرت نوحؑ کے ساتھ دوسرا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آتا ہے آپ کی سیرت کا ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ مگر کچھ نقوش ایسے بھی ہیں جو زیادہ ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک امر کی نشاندہی کرتے ہوئے ارشادِ باری ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ
وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ
مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا
بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

"تم کو چال چلنی چاہیئے ابراہیمؑ کی اور جو اس کے ساتھ تھے۔ جب انہوں نے کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور ان سے کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ واحد پر۔"

حضرت ابراہیمؑ نے دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تو گھر سے مخالفت اٹھ کھڑی ہوئی۔ باپ مخالف ہو گیا۔ برادری نے تنگ کرنا شروع کیا۔ قوم سر ہو گئی مگر آپ کے پائے استقلال کو ذرا لغزش نہ آئی۔ برابر دعوت کا کام کرتے رہے رہا اللہ کے باغیوں سے برتاؤ کا معاملہ تو آپ نے اعلان کر دیا کہ میں تمہارے عقائد سے تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔ رشتہ اور دوستی کے تعلقات ختم ہوئے۔ اس اعلانِ بیزاری کے باوجود ان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ موجود رہا۔ کہ میں اپنے ربّ سے درخواست کروں گا۔ کہ میرے باپ کو ایمان کی دولت عطا فرما کر اس کے گناہ معاف کر دے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت الی اللہ میں یہ حالات بھی سامنے آتے ہیں۔ اپنے بھی بیگانے بن جاتے ہیں مگر اس صورتِ حال سے گھبرا کر کام نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو چھوڑ دیتا ہے مگر اعلانِ برأت بیزاری اور دشمنی ان کی ذات سے نہیں بلکہ ان کے عقیدہ اور عمل سے ہے اگر وہ اپنے آپ کو بدل دیں تو اعلانِ بیزاری اپنے آپ ختم ہوا۔ اس بائیکاٹ کے ساتھ ہی ان کے حق میں دعا کا سلسلہ جاری رہے کیونکہ ان کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے۔

اس قسم کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ میرے سامنے چند نوجوان موجود ہیں جن کو گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی گئی۔ انہیں کہا گیا کہ تم نے تو خاندان کی ناک کٹوا دی۔ تم نے اپنے کنبے کو بدنام کر دیا۔ تم نے اپنی شکل بگاڑ لی۔ تم مسکین کہلانے لگے وغیرہ۔ ایسی مثالیں عام ہیں اور ایسے حالات اکثر سننے اور دیکھنے میں آتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا بیزاری اور دین سے دوری کی وبا عام ہو گئی ہے۔ بے راہ روی کے جراثیم نے انسان کو اس بری طرح متاثر کیا ہے کہ بڑے بوڑھے بھی اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ ہم نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی بچہ کوئی جوان کوئی غلط روش اختیار کرتا تھا تو والدین اور خاندان کے دوسرے بزرگ پریشان ہونے لگتے۔ اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج یہ حالات بھی دیکھ رہے ہیں کہ اگر کوئی بگڑا ہوا جوان دین کا رخ کرتا ہے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو بوڑھوں

اور بزرگوں کی دنیا میں زلزلہ آجاتا ہے۔ اور اپنی بڑائی اور بزرگی کے بل بوتے پر جوانوں کی راہ روکنے کے لئے میدان میں نکل آتے ہیں اس لئے ان حالات میں تو زیادہ مستعدی زیادہ محنت و ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے۔ ہم نے اپنی فکر نہ کی تو خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہماری جگہ وہ کسی اور قوم کو اس کام پر مقرر کر دے گا۔ اس کا دین تو بہر حال قائم رہنا ہے، ہم نہیں اور سہی۔

ان کا کیا ہے چاہنے والے تم نہ سہی تو اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو تم تنہا رہ جاؤ گے

اس راہ میں رکاوٹیں پیش آنا کوئی انوکھی بات نہیں یہ ایک فطری عمل ہے رکاوٹیں یقیناً قلب کو جوشِ عمل کو متاثر کرتی ہیں ایک عام آدمی کے لئے رکاوٹ کی وجہ سے عمل میں کچھ کمی آجانا بھی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر شخص میں اس درجے کی قوتِ ارادی نہیں ہوتی جو حضرت ابراہیمؑ کو اللہ پاک نے عطا کی تھی۔ مگر بالکل رک جانا اور چھوڑ بیٹھنا محبت کی توہین ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ پاور ہاؤس سے جس طاقت کی بجلی کی رو چلتی ہے۔ صارفین کے ہاں اتنی طاقت کی کرنٹ نہیں پہنچتی بلکہ اہلِ فن نے اس کا ایک فارمولا معلوم کیا ہے کہ الیکٹرو موٹو فورس کو ٹوٹل ریزسٹنس پر تقسیم کرتے ہیں جو حاصل قسمت ہوتا ہے اس قوت کا کرنٹ آگے پہنچتی ہے معلوم ہوا کہ ریزسٹنس یا رکاوٹ سے زور تو کم ہو سکتا ہے مگر کرنٹ ختم نہیں ہو سکتی + یہ تو بے جان بجلی کے کرنٹ کی حالت ہے ایک جیتا جاگتا انسان ایک مسلح سالک اگر رکاوٹوں کی وجہ سے کام ہی چھوڑ بیٹھے تو کتنے شرم کی بات ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کا اجمالی تصور بھی انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے باپ کو چھوڑا۔ رشتے دار چھوڑے گھر بار چھوڑا۔ مگر امتحان کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ بڑھاپے میں بیٹا عطا ہوا تو حکم ہوا کہ اس بچے اور اس کی والدہ کو ایک غیر آباد سنگلاخ زمین میں چھوڑ آ۔ آپ انہیں لے جاتے ہیں وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کے لوٹنے لگتے ہیں تو بیوی پوچھتی ہے ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہو اتنا کہتے ہیں کہ اللہ کے حوالے اور واپس چل پڑتے ہیں، بیوی، عورت ذات مگر پورے اطمینان سے کہتی ہے کہ اچھا اگر یہ بات ہے تو کوئی فکر نہیں ہمارا اللہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔ طبیعات والے جو کہتے ہیں کہ انڈکشن کے اصول کے تحت مقناطیس کا عمل ہوتا۔ یعنی کسی ٹکڑے کو مقناطیس کے ٹکڑے کے پاس رکھ دو کچھ عرصہ پاس پڑا رہنے سے وہ بھی مقناطیس بن جائے گا۔ واقعی وہ لوگ سچ کہتے ہیں بیوی جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہی تو اس کے اندر بھی توکل علی اللہ اس درجہ کی پیدا ہو گئی کہ جنگل بیابان میں بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ اسے اپنے رب پر اتنا بھروسہ ہے کہ مطلق پریشان نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے عرض یہ ہے کہ سالک کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیئے کہ لطیفۂ روح کے منور ہونے اور راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عملی زندگی میں اس کی سیرت و کردار سے یہ ظاہر ہو کہ واقعی یہ شخص ان دو اولوالعزم پیغمبروں کے

نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس میں دعوتِ دین کا جذبہ وجود رہے۔ توکل علی اللہ پیدا ہو جائے۔ اسباب پر نظر نہ ہو۔ اسباب ضرور اختیار کرے مگر نگاہ مسبب الاسباب پر جمی رہے آپ کی ذمہ داری دو گونہ ہے ایک تو اس حاصل شدہ دولت کو محفوظ رکھنا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ موجودہ ماحول میں یہ کام بھی کچھ کم مشکل نہیں بقولِ اکبر الہ آبادی

ہمیشہ پیشِ نظر ہیں رضو شکن منظر
اس انجمن میں مجھے کس طرح نمازی کی

یہ دورِ نمائش کا دور ہے ہر کام میں ہر بات میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ کہیں شو (show) میں کمی نہ آجائے اس لئے اس ماحول کی جاذبیت انسان کو راہِ حق سے قدم قدم پہ ہٹانے کی کوشش کرتی ہے ملازم ہے تو رشوت کی کشش اور جاذبیت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مزدور ہے تو کام چوری کا لالچ راہ روکتا ہے۔ تاجر اور کارخانہ دار ہے تو ملاوٹ، دھوکا، ہیرا پھیری میں نفع کی امید راہِ حق پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ اگر سالک میں توکل علی اللہ کا وصف پیدا ہو گیا ہے تو یہ ایک ہتھیار ان سب جاذبیتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہے

دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی حفاظت پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ آس پاس ڈوبنے والوں کو بچانے کی فکر بھی رہے اور اس کٹھن راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا مقابلہ کرتا چلا جائے۔ سیرۃ نوحیؑ اور اسوۂ ابراہیمیؑ اس کے لئے مشعلِ راہ ہو اور ہر حالت میں مسبب الاسباب پر نگاہ ہو۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ہدایت پر قائم رکھے۔ اور اسلام اور تمام اہلِ اسلام کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

رسولِ کریمؐ کی ادبی عظمتیں

عربی ادب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث آپ کے مکتوبات، آپ کے خطبات، اور وعظ و ارشاد کے اعلیٰ ترین نمونوں کا بہت بلند مقام ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے دُنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں کسی شخصیت کا اتنا بلند، پُر اثر، تاریخ ساز، اور دائمی اثر نہیں ہے۔

ظہورِ قدسی سے عربی زبان کی حیثیت بدل گئی، مزاج اور محاورہ بدل گیا، الفاظ و تراکیب میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسلوب اور انداز بیاں تبدیل ہوگیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ کے طفیل عربی زبان کو نہ صرف یہ کہ متفرق قبائل کے لہجوں سے نکل کر ایک متحدہ اور زندہ جاوید زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ بلکہ ادبیات سے ایک وسیع و دقیع ذخیرہ بھی میسّر آگیا۔ چنانچہ حضورؐ کی احادیث کا عربی ادب میں ایک نہایت بلند اور خاص مقام ہے۔ اور عربی ادب کی تاریخ پر زبردست اثرات ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمت سے پُر جامع، کلمات و ارشادات جو جوامع الکلم کہلاتے ہیں، ہمیشہ سے ادباء و خطباء کے کلام کی زینت اور انشاپردازی کا سہارا بنتے رہے ہیں، آپؐ کے خطبات عربی خطابت کی تاریخ کا بلند ترین نمونہ ہیں۔ آپؐ نے اپنے عہد میں جو مکتوبات، فرامین اور احکام جاری فرمائے وہ بھی عرب فصحاء و بلغاء کے ادبی رسائل میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی ادبیات کی تاریخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت اور خطیبانہ کمالات کے بے شمار پہلو ہیں، اور ان میں سے ہر ایک پہلو ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

عربی علم البلاغت کی کتابوں میں "المدح بما یشبہ الذم" کے ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد متداول ہے آپؐ فرماتے ہیں کہ میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں مگر میں قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا ہوں اور میں نے بنو سعد بن بکر میں پرورش پائی ہے۔ ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جامع کلمات عطا کئے ہیں، اور سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے بادِ صبا کے ذریعے میری مدد فرمائی ہے

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ میں عرب میں گھومتا پھرا ہوں، فصحائے عرب کے خطبات سُنے ہیں مگر آپؐ سے بڑھ کر فصیح و بلیغ کہیں بھی میں نے نہیں دیکھا۔ آخر یہ ادب آپ کو کس نے سکھایا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے تو میرے رب نے ادب سکھایا اور کیا خوب سکھایا ہے۔

ان اقوال و عبارات پر غور کیا جائے تو آنحضرتؐ کی فصاحت و بلاغت اور ادب کے چار عناصر ترکیبی نظر آتے ہیں جن میں سے دو تو ہمیں قبیلہ قریش اور قبیلہ بنو سعد بن بکر ا ظہور قدسی کے وقت عرب میں صرف دو قبیلے تھے جن کی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کا سکہ چلتا تھا، ایک قبیلہ قریش تھا جس کی زبان عربی ادبی کہلاتی اور تمام قبائل عرب کے شعراء اُن کو اپنا حکم اور سرپنچ مانتے اور قریش کے ادبی فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح بنو سعد بن بکر کا قبیلہ بھی فصاحت و بلاغت اور ادبی مقام کا مالک تھا۔ اسی قبیلے میں آپؐ نے پرورش پائی اور حضرت حلیمہ سعدیہؓ کو آپ کے رضاعی ماں ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان ہر دو قبائل کی فصاحت و بلاغت زبان دانی کا آپ پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ جب آپ یہ فرماتے ہیں کہ انا افصح العرب بید ان من قریش و نشأت فی بنی سعد بن بکر تو در حقیقت آپ اس بات کی طرف اشارہ فرماتے کہ مسبب الاسباب نے اپنے آخری پیغام کے لئے جو ذات منتخب فرمائی اس کی پیدائش اور پرورش عرب کے دو مسلّم فصیح و بلیغ قبائل میں ہوئی

فصاحت و بلاغت کا تیسرا عنصر عنایت ربّانی ہے فانک باعیننا کہ تُو تو ہماری نظروں میں ہے۔ ہماری عنایت و اہتمام کا شرف آپکو حاصل ہے اچنانچہ جب آپ فرماتے ہیں کہ ادبنی ربی فاحسن تادیبی تو آپ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید کے جو الفاظ و کلمات آپ کے قلب اطہر پر نازل ہوئے ان کی تاثیر بھی اسی عنایت ربانی کے ضمن میں آتی ہے

آنحضرتؐ کی فصاحت و بلاغت اور ادبی مقام کا چوتھا عنصر فطرتِ محمدی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظرف ہی اتنا وسیع و بے پایاں عطا فرمایا تھا جو بار نبوّت اور تبلیغ قرآن کا اصل تھا۔ ان کل شئ خلقنٰہ بقدر کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ کی فطرت میں ہی فصاحت و بلاغت کے کمالات ودیعت فرما دیئے تھے بہر حال آپؐ کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان کا کمال دراصل فیضانِ الٰہی کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے کلام نبوت پر وحی قرآنی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں آپؐ کے اسلوب بیان میں نہ تکلّف تھا نہ تصنّع تھا سلیس الفاظ میں نازک و باریک معانی بیان فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام قبائل کے لہجات کا علم دیا تھا چنانچہ آپؐ ہر قبیلے سے اس کے اپنے میں بات کرتے تھے مشہور عرب عالم و ادیب ابی حنظ کہتا ہے کہ آنحضرتؐ نہ تو الفاظ کی تلاش کی مشقت کرتے تھے اور نہ معانی پیدا کرنے کے لئے کسی تکلّف سے کام لیتے تھے۔ آپؐ نے لفّاظی، گلا پھاڑ

کرا اور باچھیں کھول کر بات کرنے کو ناپسند فرمایا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں تکلف اور تصنع والی خطابت سے پرہیز کرتا ہوں مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو بانونی اور زبان دراز ہوتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے خطبات و ارشادات میں ہمیشہ انتہائی پختگی۔ صحت عامہ اور سچائی کو جادہ گر دیکھا۔ دوران خطابت و کلام آپ کبھی غلطی نہ کرتے کہ تائید الٰہی ہمیشہ آپ کے شامل حال رہتی تھی۔ ابو عثمان ابی حفظ نے البیان والتبیین میں آنحضرتؐ کے متعدد، جوامع الکلم اور خطابت نقل کرنے کے علاوہ آپ کی فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان کے متعلق بھی مفصل بحث کی ہے۔ وہ آپ کے اندازِ خطابت کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے۔ آپؐ کے کلام کے حروف کی تعداد کم ہوتی مگر ان میں معانی کی مقدار ہمیشہ زیادہ ہوتی۔ آپؐ تکلف و تصنع سے اجتناب کرتے تھے اور صحیح معنی میں اللہ کے اس قول کی عملی تفسیر تھے کہ وما انا من المتکلفین یعنی میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں بھلا آپؐ کیسے تکلف کر سکتے تھے جبکہ آپؐ تو تقریر و خطابت میں باچھیں کھولنے اور آواز بھاری کرنے کو معیوب قرار دیتے تھے۔ جہاں تفصیل کی ضرورت ہوتی وہاں شرح و بسط سے کام لیتے تھے، جہاں اختصار کا موقع ہوتا وہاں مختصر خطاب کرتے تھے۔ آپؐ کے کلام میں نہ تو غیر مانوس قسم کے الفاظ ہوتے اور نہ سوقیانہ انداز، بلکہ آپؐ جب بھی بولتے حکمت کے چشمے پھوٹتے۔ آپؐ کے اسلوب بیان کو اللہ کی حفاظت و تائید حاصل تھی۔ آپؐ کا بیان معجز نظام ایسا تھا جیسے اللہ کی جانب سے محبوب و مقبول ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جس میں ہیبت بھی تھی اور شیرینی بھی، جو فصاحت الفاظ کثرت معنی کے ساتھ ساتھ حسن تفہیم کا پہلو بھی رکھتا تھا۔ آپؐ کی ہر بات اس قدر واضح اور عام فہم ہوتی کہ دوسرے یا دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں رہتی تھی آپ کے کلام میں کبھی لغزش یا نقص نہ پیدا ہوا۔ آپؐ کا بیان مدلل و مسکت ہوتا۔ آپؐ کبھی کسی خطیب سے لاجواب نہ ہوئے۔ آپؐ کے طویل خطبات میں پُر مغز و مختصر جملے ہوتے۔ آپؐ ہمیشہ حق و صداقت کی بات کرتے۔ الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لینے یا عیب جوئی سے ہمیشہ اجتناب کرتے۔ نہ سست روی سے کام، نہ جلد بازی سے، نہ حد سے زیادہ طول دیتے اور نہ بات کرنے سے عاجز آتے بلکہ آپؐ کے کلام سے زیادہ نفع بخش، لفظ و معنی میں توازن، بلند مقصد، زیادہ پُر اثر، ادائیگی میں آسان تر، معنی میں زیادہ فصیح اور مقصد کو زیادہ واضح کلام کسی کا نہیں دیکھا۔

یہ تو ہے حافظ کی رائے۔ مشہور سیرت نگار قاضی عیاض الشفا میں آنحضرتؐ کے ادبی مقام سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک فصاحت اور بلاغت بیانی کا تعلق ہے تو اس میں آپؐ کا بلند و افضل ترین مقام تھا۔ آپؐ کے مرتبے کو سب جانتے تھے۔ سلاست و روانی، بیان کا کمال، بات میں اختصار، خوبصورت لفظ، پُر معنی قول، صحیح معنی اور تکلف کی کمی آپؐ کے کلام کے خصائص تھے۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے جامع کلمات کمال کی حکمت عطا کی تھی اور لہجات عرب کا علم دیا تھا چنانچہ آپؐ ہر قبیلے سے اس کے لہجے میں بات کرتے تھے۔"

اِستقامتِ حق کا ایک منظر[1]

پس منظر:۔ عباسی خلیفہ مامون رشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) بغداد میں تختِ خلافت پر متمکن ہے اگرد و پیش ایسے علماء اکٹھے ہوگئے ہیں جو معتزلی عقیدے کے ہیں، اُن کے اثر سے مامون بھی معتزلی ہوگیا ہے، یہ لوگ[2] حق تعالیٰ پر عذاب و ثواب واجب مانتے اور صفاتِ الٰہی کو مخلوق و حادث جانتے اور خود کو اصحاب العدل والتوحید کہتے ہیں، کلام اللہ بھی چونکہ صفت ہے، اس لئے ان کے نزدیک مخلوق ہے، بعد کو مامون کا غلو اس میں اتنا بڑھتا ہے کہ دوسرے مسلمان کو مشرک قرار دیتا ہے اور رقہ سے بغداد کے کوتوال اسحاق کو احکام بھیجتا ہے کہ علمائے بغداد میں جو قرآن کے مخلوق ہونے سے انکار کریں ان کو پا بہ زنجیر روانہ کر دیا جائے جان کس کو پیاری نہیں ہوتی، جان کے خوف سے چار کے سوا تمام علماء جبراً و قہراً حکومت کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ بالآخر اُن میں سے بھی دو[3] ہمت ہار جاتے ہیں، اور صرف امام احمدؒ اور محمد بن نوحؒ رہ جاتے ہیں، اُن کو مقید کر کے مامون کے حضور میں بھیج دیا جاتا ہے۔

اثنائے راہ میں ایک شخص ابو بکر نامی دریافت کرتا ہے۔

"احمد! اگر خلیفہ تمہارے قتل پر آمادہ ہوگیا تو کیا تُم اس کی بات مان لو گے؟" جواب دیتے ہیں "نہیں"

اسی طرح ایک اعرابی جابر بن عمار ملتا ہے اور کہتا ہے:۔

"دیکھو! ایک دن تو مرنا ہے، اگر آج حق کی حمایت میں مارے گئے تو سیدھے جنت میں جاؤ گے۔"

جب آگے بڑھتے ہیں تو ایک شخص آکر مامون کے مرنے کی خبر دیتا ہے۔ امام کہتے ہیں "میں نے خدا سے دُعا مانگی تھی کہ مامون کا میرا سامنا نہ ہو۔" اس اثناء میں آپ کے رفیق کار محمد بن نوحؒ بھی انتقال فرماتے ہیں اور امام قید میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ علماء کا ایک وفد حاضر ہو کر حضرت کی احادیث پیش کرتا ہے، جواب دیتے ہیں "کیا تُم وہ احادیث بھول گئے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تُم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں اُن کے جسموں کو آرے سے چیرا جاتا تھا پھر بھی وہ دین سے نہ پھرتے تھے، مجھے تو دراصل نہ قید کا ڈر ہے نہ قتل کا، البتہ کوڑوں کی سزا سے ہول آتا ہے۔"

اُس وقت ایک قیدی کہتا ہے "یا ابا عبد اللہ! دو کوڑوں تک تو تکلیف کا احساس رہتا ہے پھر ہوش بھی نہیں رہتا کہ کہاں ضرب لگی۔" اس پر آپ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

امام کی وضع و قطع کے بارے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ آپ خوش رو، گندمی رنگ، میانہ قد ہیں، عموماً سفید لباس استعمال کرتے ہیں،

---

[1] اس مضمون کی بنیاد مناقب الامام احمد بن حنبلؒ مؤلفہ ابن جوزی پر ہے

[2] شرح عقائد نسفی۔

[3] ابن حنبل محمد ابو زہرہ۔

سر پر عمامہ ہے اور جسم پر قمیض اور پاجامہ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں آپ کی عمر ۵۴ سال ہے اور قویٰ معمولی۔ مامون آخر وقت اپنے بھائی اور جانشین معتصم (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) کو وصیت کر جاتا ہے کہ خلق قرآن سے انکار کرنے والوں کے ساتھ تشدد کیا جائے۔

چنانچہ امام احمد کو قید خانے میں طلبی کا حکم پہنچتا ہے معتصم[1] کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ یہ ایک قوی اور بہادر انسان ہے جس کے چہرے سے ہیبت ٹپکتی ہے اہلِ علم اور سخت مزاج ہے، شاہی دربار پوری سطوت و جبروت کے ساتھ آراستہ ہے اُمراء ادب سے اپنے اپنے مقام پر حاضر ہیں خلیفہ کے قریب ہی مشہور معتزلی عالم دربار احمد بن ابی داؤد بیٹھا ہے، امام احمدؒ اس حالت میں آتے ہیں کہ ہر پاؤں میں دو دو بھاری بیڑیاں ہیں، اور منہ میں روزہ ہے بیڑیوں کے بوجھ اور کمزوری سے قریب ہے کہ گر پڑیں اس لئے بیڑیوں کو کمر بند سے باندھ کر اٹھائے ہوئے ہیں بالآخر گفتگو ہوتی ہے:۔

معتصم: (امام احمدؒ سے) میرے قریب آؤ، اور قریب آؤ بیٹھو امام احمدؒ۔ (بیٹھ کر) کیا مجھے بولنے کی اجازت ہے؟

معتصم: اجازت ہے۔

امام احمدؒ: خدا اور رسولؐ نے لوگوں کو کس امر کی دعوت دی تھی؟

معتصم: (تھوڑے تامل کے بعد) توحید کی گواہی کی۔

امام احمدؒ: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے علاوہ امیر المومنین کے جد امجد حضرت عباسؓ کی روایت کردہ حدیث پر میرا مدار ہے جس میں جناب رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ توحید و رسالت کی گواہی دو اور زکوٰۃ و خمس ادا کرو۔

معتصم: (متاثر ہو کر) کیا کروں اگر یہ معاملہ میرے عہد سے پیشتر نہ چھڑ گیا ہوتا تو میں تم سے ہرگز تعرض نہ کرتا۔ (علمائے دربار خصوصاً عبد الرحمان بن اسحاق سے مخاطب ہو کر) تم لوگ احمد سے مناظرہ کرو۔

عبد الرحمان: (امام سے) تم قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

امام احمدؒ: تم خدا کے علم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ (عبد الرحمٰن سکوت اختیار کرتا ہے)

ایک اور عالم: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" (اللہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے) اور قرآن بھی شے ہے لہٰذا قرآن بھی اُسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

امام احمدؒ: اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے "تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا" (وہ آندھی ہر شے کو اپنے مالک کے حکم سے تباہ کر دے گی) چنانچہ جب قوم عاد پر آندھی آئی تو اس نے ہر شے کو تباہ کر دیا بجز اس کے جس کو خدا نے بچانا چاہا، مراد ہے کہ "شے" میں استثناء بھی ہو سکتا ہے۔

ابن ابی داؤد: (غصہ میں) یا امیر المومنین! واللہ یہ شخص گمراہ، گمراہ گر اور بدعتی ہے

معتصم: (امام سے) احمد تمہیں کیا ہو گیا ہے، یہ کیا کہتے ہو؟

امام احمدؒ: مجھے کتاب الٰہی یا سنت رسولؐ کی کوئی دلیل دو، تو میں قائل ہو جاؤں۔

معتصم: یا ابا عبد اللہ! تم ابن ابی داؤد سے کیوں بحث نہیں کرتے؟

امام احمدؒ: میں اس کو اہل علم میں شمار نہیں کرتا جو اس سے بحث کروں۔

معتصم: واللہ، اگر تم میری بات مان لو تو میں اپنے ہاتھ سے تمہاری زنجیر کھول دوں، اور تمہاری خدمت کروں، احمد! بخدا جتنی میں اپنے بیٹے ہارون پر شفقت کرتا ہوں اُس سے زیادہ تم پر کرتا ہوں۔ بولو کیا

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی ۲۱۲۔

کہتے ہو؟

امام احمدؒ: مجھے کتاب اللہ یا سنتِ رسول سے ثبوت دو تو مانوں۔

(اس پر معتصم برہم ہوتا ہے، اُس کے حکم سے لوگ اُٹھ جاتے ہیں اور احمد اور عبدالرحمٰن رہ جاتے ہیں)۔

عبدالرحمٰن: امیر المومنین، میں ان کو تیس برس سے جانتا ہوں یہ آپ کی اطاعت اور آپ کی معیت میں حج و جہاد کے قائل ہیں۔

معتصم: بے شک یہ عالم و فقیہ ہیں، ایسا شخص میرے پاس رہے تو کیا بُرائی ہے؟ (امام سے) تم صالح رشیدی کو جانتے ہو، وہ میرا اُستاد تھا، ایک دفعہ میں نے قرآن کی نسبت، سوال، جس پر اُس نے مجھ سے اختلاف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اس کو سخت تعزیر دی۔ تم اب بھی میری بات مان لو۔ تاکہ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں قید سے رہا کر دوں، ورنہ مجھے قرابت نبوی کی قسم! میں تمہیں بُری طرح پٹواؤں گا۔

امام احمد: مجھے کتاب اللہ اور سُنتِ رسولؐ دکھاؤ۔

(بحث طول کھینچتی ہے، معتصم بگڑ کر اٹھ جاتا ہے۔ امامؒ اپنے تاریک حجرے میں مقفل کر دیئے جاتے ہیں، شام کو افطار کے وقت کھانا آتا ہے مگر آپ واپس کر دیتے ہیں، شب میں معتصم کے حکم سے ابن ابی داؤد آکر سمجھاتا ہے)

ابن ابی داؤد: مجھے تمہاری گرفتاری کا رنج ہے، یاد رکھو! امیر المومنین نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں سخت مار لگائیں گے اور ایسی جگہ قید کر دیں گے جہاں سُورج کی روشنی کو ترس جاؤ گے۔

(امام کوئی جواب نہیں دیتے اور وہ چلا جاتا ہے، صبح کو پھر دربار میں طلبی ہوتی ہے، اور مناظرے کا بازار گرم ہوتا ہے مگر بے سُود۔ اگلے روز پھر حاضری کا حکم آتا ہے، امام محافظ سے ایک ڈوری مانگ کر اس سے بیڑیوں کو باندھ لیتے اور کمر بند باجامے میں ڈالتے ہیں کہ مبادا ضربِ تازیانے سے ستر کھل جائے، آج دربار کچھ بھرا ہوا ہے، کئی جلاد نیزے، تلواریں اور کوڑے لئے کھڑے ہیں، ——— معتصم وہی بات دوہراتا ہے، اور وہی جواب پاتا ہے)

معتصم: (بگڑ کر) ان کو پکڑ کر گھسیٹو اور کپڑے اُتار لو۔ (حکم کی تعمیل ہوتی ہے، امام احمدؒ کے پاس حضرت رسولِ خداؐ کا موئے مبارک ہے جس کو آپ قمیض کی آستین میں چھپا لیتے ہیں، بعض لوگ قمیض کو پھاڑنا چاہتے ہیں، مگر معتصم روک دیتا ہے، پھر قمیض اتاری جاتی ہے اور عقابین اور تازیانے منگائے جاتے ہیں، جب امام عقابین میں لٹکائے جانے پر بھی ثابت قدم رہتے ہیں، تو معتصم جیسے سنگ دل کو بھی رحم آجاتا ہے)

ابن ابی داؤد: حضور! اگر آپ نے احمد کو چھوڑ دیا مامون کے مذہب کو چھوڑا، اور اس کی وصیت سے مُنہ موڑا

(اس پر معتصم مُشتعل ہو جاتا ہے)

معتصم: (جلادوں سے) بڑھو تم میں سے ہر شخص پُوری قوت سے دو دو کوڑے لگائے، اور پیچھے ہٹ کر دُوسرے جلاد کو موقع دے۔ (جلاد تعمیل کرتے ہیں) معتصم ہر جلاد سے کہتا ہے، زور سے مار، خُدا تیرے ہاتھ قطع کرے۔ اُنتیس ۲۹ کوڑے لگائے جا چکے ہیں، امام ہر ضرب پر اللہ کا نام لیتے اور القرآن کلام اللہ غیر مخلوق کہتے ہیں)

معتصم: احمد! کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ خوشامدی درباریوں میں سے ایک (تلوار کا قبضہ چھو کر)

احمد! کیا تم اپنی من مانی کر کے رہو گے؟ اور کسی کی بات نہ سنو گے۔

دوسرا: خلیفۂ وقت کھڑے ہیں اور تم اپنی ضد پر قائم ہو۔

تیسرا: یا امیر المومنین! اس شخص کو قتل کیجئے۔ عذاب و ثواب میری گردن پر۔

چوتھا: عتاب خدا کا، سرکار (معتصم) روزے سے ہیں اور دھوپ میں کھڑے ہیں۔

پانچواں: احمد! آخر تمہارے رفقاء ہیں کس نے یہ ضد کی جو تم کر رہے ہو۔

(خلیفہ پھر سمجھاتا ہے، مگر جواب نفی میں پاتا ہے)

قاضیانوں کی ضرب برابر پڑ رہی ہے، یہاں تک کہ امام احمدؒ بے ہوش ہو جاتے ہیں، بیڑیاں الگ کر دی جاتی ہیں، جسم مبارک کو زمین پر ڈال کر بوریے سے ڈھک دیا جاتا ہے، ہوش آنے پر ستو پیش کئے جاتے ہیں، مگر وہ صاحب عزیمت یہ کہہ کر واپس کر دیتا ہے کہ میں روزہ نہیں توڑ سکتا۔ مجلس میں پہنچنے پر برف کا پانی لایا جاتا ہے، مگر وہ بھی نظر التفات سے محروم رہتا ہے۔ اتنے میں نماز کی اذان ہوتی ہے، ابن سماعہ نماز پڑھاتے اور امام احمد علیہ الرحمۃ ان کی اقتدا فرماتے ہیں)

ابن سماعہ: احمد تمہارے جسم سے خون جاری ہے تمہاری نماز کیوں کر ہوئی؟

امام احمدؒ: حضرت عمرؓ جب زخمی کئے گئے تھے تو ان کے جسم سے بھی خون بہتا تھا، اور اسی حالت میں انہوں نے نماز ادا کی۔

اس کے بعد معتصمؒ نے ہار کر آپ کو رہا کر دیا کیوں کہ پبلک کے اجتماع سے اس کو اندیشہ ہو گیا تھا

یہ تھی ایک جھلک اس استقامت علی الحق کی جس کا مظاہرہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا۔ درحقیقت صداقت، جرأت اور بھوک پیاس اور جسمانی ضرب میں استقامت کی ایسی مثالیں تاریخ میں کمیاب۔ خود معتصم کے باڈی گارڈ کا بیان ہے کہ میں نے احمد جیسا ثابت قدم اور بلند حوصلہ شخص نہیں دیکھا، اس روز ان کی نظر میں ہم لوگوں کی وقعت مکھی سے زیادہ نہ تھی۔ جلاد نے اعتراف کیا کہ میں نے ان کو اسی کوڑے اس شدت سے مارے کہ اگر ہاتھی کو مارتا تو وہ دھم سے گر جاتا۔

اس ابتلاء کے بعد لوگوں نے امام علیہ الرحمۃ سے عرض کیا کہ آپ معتصم کے لئے بددعا کیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جو ظالم کو بددعا کرے وہ صابر نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اس کو معاف کر دیا تھا کیوں کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے

فمن عفیٰ واصلح فاجرہٗ علی اللہ (القرآن حکیم)

"جو کوئی معاف کر دے، اور صلح کر لے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے"

اگر ایسے موقع پر امام ممدوحؒ رخصت پر عمل کر لیتے تو بظاہر جائز تھا مگر آپ جانتے تھے کہ یہ ایک دینی مسئلہ ہے، اور آپ کی حیثیت ایک مقتدا کی ہے۔ اور اس عہد میں اس جہاد کے لئے آپ سے بڑھ کر احق کون ہو سکتا تھا۔

چنانچہ جب کسی شخص نے آپ سے کہا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ تو آپ نے فرمایا اچھا! باہر جاؤ اور جو دیکھو وہ آکر مجھے بتاؤ۔

اس شخص نے آکر کہا کہ ہزارہا مخلوق خدا ہاتھوں میں قلم دوات اور کاغذ لئے باہر اس انتظار میں کھڑی ہے کہ امام جو مسائل بیان فرمائیں قلم بند کرتے جائیں یہ سن کر امام احمدؒ نے کہا مجھے قتل ہونا گوارا ہے مگر اتنے بندگان کا گمراہ ہونا گوارا نہیں

لے معتصم کے بعد واثق کے زمانے میں بھی یہ کاروبار جور جاری رہا، مگر کچھ دنوں کے بعد ایک عالم کے مسکت اور پُر سطف استدلال سے متاثر ہو کر اس نے یہ سلسلہ موقوف کر دیا۔ متوکل اگرچہ ناہبی تھا مگر اس معاملے میں اس نے معتزلہ کا زور توڑا، اور "محی السنۃ" کہلایا۔ (تاریخ الخلفاء)

حافظ عبدالرزاق

کونوا عباد اللہ

دین کے عملی پہلو یعنی تصوف وسلوک کے متعلق ایک غلط فہمی عام پائی جاتی ہے کہ یہ نظام ترک دنیا کی تعلیم کے سوا کچھ نہیں اور یہ کہ صوفی کی نگاہ بس اپنی ذات تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے اور وہ معاشرے کا ایک مفید فرد ہونے کی بجائے الٹا اس پر بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی غلط بیانی ہے جس کا پرچار کسی خاص منصوبے کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا فائدہ کسی کو کیا پہنچ سکتا تھا ہاں مستشرقین نے اسے خوب ایکسپلائٹ کیا چنانچہ ڈاکٹر براؤن نے پوری مجتہدانہ شان کے ساتھ یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ :-

"تصوف مسلمانوں کے دور انحطاط کی پیداوار ہے"

یار لوگوں نے اسے یوں پلے باندھا جیسے وحی منزل من اللہ ہے۔ اتنا نہ سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا میدان تو فارسی ادب کی تاریخ ہے پھر تصوف کے متعلق ان کا قول کیونکر سند قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی فن پر تنقید تو اہل فن اور ماہرین فن ہی کا منصب ہے۔ علم سے بے بہرہ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات تو معذور ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ اہل علم طبقہ کے بعض افراد بھی اس پروپیگنڈا کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔

تصوف کا مقصد معرفت الٰہی ہے۔ معرفت کی بسم اللہ یہ ہے کہ انسان یہ سوچے کہ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اپنے خالق سے اس کا تعلق کیا ہے؟ پھر اس بات کا جائزہ لے کہ کیا وہ اپنا مقصد تخلیق پورا کر رہا ہے؟ اگر نہیں تو اسکی فکر کرنی چاہیئے۔ انسان کو جب اس کا احساس ہو گیا تو حقائق کے علم کی راہ کھل گئی جب یہ علم ایک جذبہ اور قوت متحرکہ بن گئی تو عملاً مقصد تخلیق پورا کرنے کی طرف بڑھنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ جب عمل میں اخلاص کا وصف کمال کو پہنچا تو وہ علم "حال" بن گیا۔

انسان کا مقصد تخلیق خالق نے خود ہی بتا دیا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ جو میں کہوں وہ کریں اور کریں بھی شوق، محبت عقیدت اور خشوع وخضوع کے ساتھ۔ اس مختصر سے اعلان نے دو امور کی نشاندہی کر دی، اول انسان کا مقصد تخلیق دوم حصول مقصد کا طریقہ یعنی اپنے خالق سے قلبی تعلق استوار کرنا۔ جب تک اس مقصد کا قوی احساس نہ ہو اور اس تعلق کو نباہنے کا حقیقی جذبہ موجود نہ ہو انسان نہ تو اپنی ذات کیلئے کسی مستقل افادیت کا حامل ہو سکتا ہے نہ معاشرے کا مفید رکن بن سکتا ہے۔

خالق کے ساتھ معاملہ کھرا رکھنا انسان کی کامیاب زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو مخلوق

دوسرا پہلو مخلوق کے ساتھ تعلق کا احساس اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی فکر ہے۔ تصوف کا کام یہ ہے کہ سالک کو اپنے منصب سے آشنا کرے اور وہ ہے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی مومن کو مخلوق کی خیر خواہی اور بہتری کی تدابیر سوچنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود غرضی، خود بینی اور خود پرستی کی جڑ ہی کٹ گئی۔ پھر اس خیر خواہی کو مبہم نہیں رکھا گیا بلکہ خیر خواہی کی حقیقی صورت کی نشاندہی کر دی گئی تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو۔ دعوت الی اللہ کا کام جتنا اہم اور عظیم ہے اسی نسبت سے مشکل اور پر خطر بھی ہے کیونکہ ایک برخود غلط انسان کے اندر اسکی وجہ سے عجب، خود ستائی اور کبر جیسے رذائل پیدا ہونے کا المیہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسکی پیش بندی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ یعنی یہ کام کسی پر احسان نہیں بلکہ خالق کے ساتھ بندے کا جو تعلق ہے اس کا تقاضا یہی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے ایک لفظ تبلیغ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر کام کے کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ تبلیغ کا کام کرنے اور سلیقے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد باری ہے اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ یعنی دعوت الی اللہ کا کام کرو اور حکمت تبلیغ کو ملحوظ رکھو۔ ہر کام سیکھنے سے آتا ہے۔ اس لئے حکمت تبلیغ سیکھنا بھی لازمی ہے

سب سے مواقع تبلیغ سے واقفیت ہونا ضروری ہے حافظ ابن القیم نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین میں مواقع امر بالمعروف کی چار صورتیں لکھی ہیں۔

۱۔ منکر کو روکنے سے اصلاح کی توقع ہو۔ اور اس کی جگہ نیکی پیدا ہونے کی امید ہو

۲۔ اگر اس کے ازالہ کی امید نہ ہو تو اس کے خفیف ہونے کی امید ہو۔

۳۔ اس کے ہم وزن دوسری برائی پیدا ہونے کا خطرہ ہو

۴۔ اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہونے کا خطرہ ہو

پہلی دو صورتوں میں امر بالمعروف ضروری ہے۔ تیسری صورت انسان کے احساس و تمیز پر موقوف ہے۔ اور چوتھی صورت حرام ہے۔

تبلیغ کے لئے مناسب موقعہ مل جائے تو آداب تبلیغ کی واقفیت ضروری ہے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے انداز تبلیغ کا بیان جس تفصیل سے ہوا ہے۔ اس پہلو میں اس سے کامل رہنمائی ہوتی ہے مثلاً (۱) اپنا رویہ ایسا بناؤ کہ مخاطب تمہیں اپنا خیر خواہ سمجھے۔ جیسے دو قیدیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا اِنَّا نَرٰىكَ

مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑے مخلص اور خیر خواہ ہیں ۔

۲- خطاب اس طرح کرو کہ مخاطب کو اپنے مسائل کا حل یقینی نظر آئے ۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِہٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُکُمَا بِتَاْوِیْلِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا ۔ یعنی تمہارے کھانے کا وقت تو مقرر ہے ۔ کھانا آنے سے پہلے میں تمہارے مسئلہ کا حل تمہیں بتا دونگا ۔

۳- اپنی شخصیت منوانے کا خیال نہ ہو بلکہ اللہ کے دین کا تصور دلایا جائے ۔ جیسے آپ نے فرمایا ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ۔ یعنی تمہاری عقدہ کشائی کرنا میری ذاتی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہوگا مگر میرے رب نے مجھے یہ علم سکھایا اور اس کی اہلیت عطا کی ہے ۔

۴- اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا جائے ۔ جیسا آپ نے فرمایا " اللہ کا کرم ہے کہ میں نے ایسے لوگوں کی روش اختیار کرنے سے احتراز کیا جو اللہ سے واقف نہیں اور آخرت کا یقین نہیں رکھتے ۔ اور ان لوگوں کی روش اختیار کی جو اللہ کی پسندیدہ راہ پر چلتے رہے مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ ۔

۵- اس دوران بھی اپنی عظمت نہ جتائی جائے نہ اپنا امیج بنانے کی کوشش کی جائے ۔ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ ۔ یعنی ان باتوں کا فہم عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا ہم پر خصوصی فضل

۶- اس امر کا اظہار کرنا کہ جو لوگ اللہ کی نعمت کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہیں اسکی رحمتوں سے محروم رہتے ہیں

۷. مخاطب کی سوچ کو اپیل کیا جائے اسکی فکر کو بیدار کیا جائے اور مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق خطاب کیا جائے

۸. پھر اصل بات پیش کر دی جائے اس طرح کہ مرض کی تشخیص بھی ہو اور اس کا علاج بھی ہو ۔

ان اصولوں کو سامنے رکھ کر صوفیائے کرام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں :-

اولاً متقدمین صوفیائے کرام موجودہ بگڑے ہوئے مفہوم کے مطابق صوفی نہیں تھے بلکہ وہ صوفی ہونے کے ساتھ مفسر، محدث اور فقیہہ بھی تھے ۔ صوفیاء کرام میں سب سے پہلی اور مشہور شخصیت حضرت حسن بصریؒ کی ہے ۔ تفسیر اور حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھئے اس میں ان کے تفسیری اور علمی نکات آپکو ملیں گے پھر ان حضرات میں سے حضرت ذوالنون مصریؒ کو دیکھئے اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور فقیہہ امام مالکؒ کے شاگرد تھے بشر بن الحارث عظیم الشان محدث تھے ۔ حارث محاسبیؒ جامع علوم تھے ۔ حضرت داؤد طائیؒ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے ۔ ابو سلیمان دارانیؒ ثقہ محدث تھے ۔ یحییٰ بن معاذ امام وقت تھے ۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی

بلند پایہ فقیہ تھے ۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ مفسر، محدث متکلم اور فقیہ تھے کہاں تک شمار کیا جائے ۔

ثانیاً ۔ تبلیغ و اشاعت اسلام میں مسلمانوں کی کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو اس میدان میں بھی اہل تصوف سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس ذکر اور مجلس وعظ میں سینکڑوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ہزاروں بدکاروں نے توبہ کر کے صحیح اسلامی زندگی اختیار کر لی قلائد الجواہر میں لکھا ہے کہ آپکی کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام قبول نہ کرتے ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجمیر سے دہلی تک کے سفر کے دوران انکی تبلیغ سے سینکڑوں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے ۔ حضرت مجدد سرہندیؒ کے متعلق یہ کہہ دینا ہرگز مبالغہ نہیں کہ آپ کا وجود نہ ہوتا تو اس ملک میں اکبر کا دین الٰہی ہوتا یا خالص کفر ۔ ان تاریخی حقائق سے نہ جانے لوگ کیوں آنکھیں بند کر کے فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ تصوف تو بس کونے میں بیٹھ کے اللہ ھو کرتے رہنے کا نام ہے جو زندگی سے فرار کی ایک معصوم صورت ہے پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ اصل اور نقل میں تمیز نہیں کی جاتی ۔ نقل کو اصل فرض کر کے اصل کے خلاف فیصلہ دے دیا جاتا ہے حالانکہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کوئی چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے نقالوں اور جعل سازوں کی بن آتی ہے مگر ان کی وجہ سے کوئی شخص اصل سے نہ بدگمان ہوتا ہے نہ دل برداشتہ جعلی کرنسی کی وجہ سے بھلا کسی نے اصلی کرنسی سے بائیکاٹ کیا ہے اس لئے یہ کوئی معقول طرز عمل نہیں کہ آدمی نقل کی وجہ سے اصل کے متعلق بدگمانی کرنے لگے ۔

(باقی آئندہ)

علوم ابتدا میں صرف علوم ہوتے ہیں ۔ مگر کچھ رسوخ کے بعد قلب میں اپنا ایک رنگ پیدا کر دیتے ہیں ۔ جس کے بعد قلب میں لطف اندوزی یا انقباض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت اس کا نام "حال" ہو جاتا ہے ۔

علوم جب تک حال یا وجدان کی شکل اختیار نہیں کرتے اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبۂ عمل پیدا ہو سکتا ہے نہ عمل میں ذوق نصیب ہو سکتا ہے

علماء کا اتحاد کیوں اور کس طرح ؟

(مولانا سید شبیر احمد ہاشمی)

صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کا ایک مشترکہ کنونشن بلا کر ایک بڑی ہی لائق ستائش خدمت انجام دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب حکومت یہ سمجھنے لگے ہیں کہ نظام مصطفیٰ کا نفاذ علماء کے تعاون کے بغیر مشکل ہے۔ علماء کا اس طرح مل بیٹھنا اسلامی اخوت اور دینی یگانگت کو ظاہر کرتا ہے۔ خدا کرے کہ صدر مملکت کی یہ آرزو پوری ہو کہ ملت کے تمام طبقے باہم شیر و شکر ہو کر مشرق سے اٹھتی ہوئی سرخ آندھی کا مقابلہ کر سکیں لادینیت کے پھنکارتے ہوئے اژدہا اور کمیونزم کے ناچتے ہوئے دیو کا کوئی مداوا سوچا جا سکے۔ سب سے بڑی بات تو اتحاد کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھاما جائے۔ دین کو فرقوں میں بٹنے سے روکا جائے اور تمام مسلمان بنیان مرصوص ہو جائیں۔ لیکن آج تک اسلام کے نام لیوا تمام فرقے نعروں کے باوجود ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکے۔ یہ بریلوی، دیوبندی، وہابی وغیرہ فرقے اور گروہ محض اور محض بدقسمتی ہیں۔ برصغیر میں دو فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال اور قتل و قتال کا جو بازار گرم کیا اس پر تاریخ شرمندہ ہے۔ اور وہ فرقے ہیں بریلوی اور دیوبندی۔ اور دونوں کا دعویٰ سنی اور حنفی ہونے کا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر توحید و رسالت پر ایمان کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ لیکن ایک عام آدمی جب ان کے حجروں میں جھانکتا ہے تو وہ حیرت میں گم رہ جاتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

پبلک کے سامنے علماء کنونشن میں مل بیٹھنا، ایک سٹیج پر تقریریں کرنا اور اپنے حجروں میں اس سب کے خلاف گرم گفتاری بلکہ سازش کرنا علماء کے لئے بڑا ہی شرمناک ہے جنرل صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے کہ یہ اکابر ملت قوم کو درس اتحاد دیں لیکن تاریخ کے اوراق، حالات کی سنگینی اور علماء کے قول و کردار کے تضاد سے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ میں چونکہ علماء کے قریب رہتا ہوں ان کے قول و کردار سے کسی حد تک واقف ہوں اس لئے حکومت اور عوام کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں

علماء کنونشن میں جناب صدر نے چودہ علماء پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل تشکیل دی۔ ان میں سے حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی، حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ، حضرت علامہ ابوالنور منظور احمد شاہ، اور حضرت علامہ محمد بخش مسلم کا تعلق بریلوی مکتب فکر سے ہے۔ علماء کنونشن میں یہ لوگ بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اتحاد کی خبروں میں یہ خبر بھی دی کہ سب حضرات نے ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی ہے جبکہ میں نے مندرجہ بالا چار حضرات میں سے پیر کرم شاہ کے علاوہ

تینوں بزرگوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی اور مشترکہ نماز کے بارے میں سوال کیا تو تینوں حضرات نے بیک زبان کسی دیوبندی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی تردید کی بلکہ یکم ستمبر ۱۹۸۰ء بعد نماز ظہر حزب الاحناف لاہور کے سالانہ جلسہ میں بورڈ کے ایک ذمہ دار رکن علامہ سید منظور احمد شاہ صاحب نے جلسہ عام میں اس کی تردید کی۔ سوال یہ ہے کہ یہ علماء آخر تردید کیوں کرتے ہیں اور کیوں باہمی مشترکہ نماز نہیں پڑھتے۔ میری نظر میں اس کے اسباب واضح ہیں کہ بریلوی اور دیوبندی نعرہ بازی کے باوجود اپنے مابین بڑے شدید اختلافات رکھتے ہیں میری نظر میں اگر صدر مملکت ہمت کریں تو یہ گنبد بھی مسمار ہو سکتے ہیں۔ پہلے اختلافات کا ایک تجزیہ کرلیں بعد میں ان کے مٹانے کی تجاویز پر غور کرتے ہیں۔

اختلافات کی دو قسمیں ہیں (۱) سیاسی (۲) اعتقادی

جہاں تک سیاسی اختلافات کا تعلق ہے گذشتہ سو برس سے دونوں مکاتب فکر ایک دوسرے کے خلاف محاذوں پر ڈٹے رہے ہیں۔ برصغیر میں دو قومی نظریے کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ تھا اس دونوں جماعتیں اپنے اپنے موقف پر دلائل کے لاؤ لشکر لاتی رہیں۔ دیوبندی مکتب فکر نے سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی کے متحدہ قومیت کی حمایت میں اپنی تمام قوتیں صرف کیں۔ انڈین نیشنلزم کو مذہبی چارہ اسی گروہ کے علماء نے فراہم کیا گاندھی، نہرو، پٹیل، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ دہلوی اور مولانا ابوالکلام آزاد ایک سٹیج پر اس نظریے کا دفاع کرتے رہے۔ آزادی کے بارے میں ہندوؤں سے موالات کا جواز بھی دیوبند نے فراہم کیا جبکہ موالات اور ہجرت میں بریلوی مکتب فکر کے قائد مولانا احمد رضا خان بریلوی نے جداگانہ موقف اختیار کیا۔ تحریک پاکستان میں دیوبندی حضرات کانگریس کے سیاسی حامی رہے جبکہ بریلوی مسلم لیگ کے سیاسی ہمدرد دیوبندی علماء میں سے علامہ شبیر احمد عثمانی وہ واحد فاضل تھے جو دیوبند کی مجموعی روش سے ہٹ کر ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے حامی بن کر ابھرے لیکن دیوبند نے اس پر مولانا عثمانی کو جو گالیاں دیں وہ مولانا عثمانی نے خود بیان کی ہیں۔

دوسری طرف بریلوی بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کے سیاسی ہمدرد رہے۔ جبکہ ان میں سے بھی مولانا حشمت علی خان نے تجانب اہلسنت اور الجوابات السنیہ نامی کتابوں میں مسلم لیگ کے خلاف فتویٰ بازی کی۔ مولانا طیب داناپوری ان کے شاگرد تھے انہی کی نگارشات فکر کا نتیجہ مندرجہ بالا دونوں کتابیں ہیں مولانا حشمت علی خان نے مسلم لیگ کی مخالفت کی لیکن کانگریس کی حمایت نہیں کی۔ نظریہ پاکستان کو غلط نہیں بتایا اور دو قومی نظریے کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے باوجود ان کے پاکستان کے مخالفانہ کردار کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ خالص دیوبندی علماء کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

ان کے پہلے اجلاس کلکتہ کی صدارت مولانا غلام مرشد نے فرمائی جن کا دیوبندی ہونا ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا۔ اس اجلاس کا خطبہ استقبالیہ بھی ایک بریلوی عالم اور صدر کے مشاورتی بورڈ کے رکن مولانا محمد بخش مسلم نے لکھا۔ مولانا بفضل خدا زندہ ہیں ان سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے مشہور رہنما مولانا ابراہیم علی چشتی، حکیم انور بابری اور مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اسی جمعیت کے رکن تھے۔ جس کے صدر مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ غرضیکہ دیوبند کے قلیل گروہ کے علاوہ تمام حضرات تقسیم ہندوستان، تشکیل پاکستان

ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں مسائل کو مسائل
ہی کی صورت میں حل کرنے کی کوشش کریں۔ تجربہ یہ ہے
کہ جب بات کی جائے نازک مسائل کی تو جواب میں حضرات
علماء ذوی وقار اپنے بزرگوں کے فضائل سنانے لگتے ہیں
جب تک افراد سے بالاتر ہو کر فرقہ دارانہ گنبدوں کو مسمار
کر کے ذاتی، جماعتی اور گروہی مفادات کو تیاگ کر خالص
اللہ اور اس کے رسول کے لئے سوچ جنم نہیں لے گی اس
وقت تک یہ الجھاؤ باقی رہے گا اس لئے میں دیوبندی مکتب
فکر کے اکابر علماء حضرات مولانا عبداللہ درخواستی،
مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالرحمن،
مولانا جمیل احمد تھانوی، مولانا محمد میاں، مولانا ضیاء القاسمی
مولانا عبدالہادی دین پوری، مولانا غلام غوث ہزاروی
مولانا احترام الحق تھانوی اور مولانا عبیداللہ انور وغیرہ
سے دست بستہ عرض پرداز ہوں کہ وہ خدا کے لئے اس
تجویز پر غور کریں اور کمر ہمت باندھ کر بوجہ عدالت
میں آتریں اور متنازعہ عبارات کی صحیح تشریح و تعبیر
کر کے فرقہ داریت کی فصیل کو پیوند خاک کر دیں ورنہ
علماء پر یہ الزام ہمیشہ قائم رہے گا کہ فرقہ داریت کا سانپ
علماء ہی دودھ سے پلتا رہتا ہے۔ دوسری طرف علمائے
بریلی کے زعماء حضرات مولانا سعید احمد کاظمی، مولانا
شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری، مولانا علامہ محمد
بندیالوی، مولانا سید محمود احمد رضوی، مولانا محمد نوراللہ
بصیر پوری، مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی، مولانا
شیخ الحدیث محمد شریف، مولانا محمد اشرف سیالوی، مولانا
منظور احمد شاہ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا
عبدالحکیم ہزاروی، مولانا طیب الرحمن، مولانا فتح محمد باروزئی
اور مولانا ابوداؤد محمد صاحب وغیرہ سے بھی اسی طرح عرض گزار ہوں
کہ وہ بر تعصب، گروہی مفاد، جماعتی عصبیت، طبقاتی آویزش
اور فرقہ دارانہ جنگ سے بالا ہو کر اس تجویز پر غور کریں اور
عدالت میں اپنے معروضات محض اللہ کی رضا کے لئے مدلل اور
مثبت انداز میں پیش کریں۔ تاکہ صدر مملکت کی نیک آرزو
پوری ہو سکے، اور فرقہ داریت کا ناچتا ہوا دیو اپنی موت آپ
مر جائے۔ اس کے ساتھ دونوں مکاتب فکر کے عوام سے بھی یہی
گزارش ہے کہ وہ ان زعماء پر بھرپور دباؤ ڈالیں کہ وہ فرقہ داریت
کو مٹانے کے لئے عملی اقدام کریں

دوسرا اختلاف فروعی نوعیت کا ہے جس میں بریلوی
حضرات کے کچھ اعمال اور کچھ رسومات شامل ہیں مثلاً فاتحہ،
تیجا، ساتواں (چالیسواں) قیام فی المیلاد، انگوٹھے چومنا،
عرس، نعرہ رسالت وغیرہ شامل ہیں۔ میری معلومات کے
مطابق بریلوی علماء ان کو محض مستحب اور مندوب قرار دیتے
ہیں یعنی ان اعمال کا کرنا باعث ثواب ہے لیکن نہ کرنے پر
گرفت نہیں ہے (مگر عملاً یہی اعمال اور رسومات حق و باطل
کا معیار بن چکی ہیں اور آدمی کے مومن یا کافر ہونے کا فیصلہ
ان رسومات کی بنا پر ہی کیا جاتا ہے) اس لئے یہ اختلاف بھی
کسی نزاع کا باعث نہیں بننا چاہئے۔ (لیکن جانبین سے افراطی
علماء نے معاملہ بگاڑ رکھا ہے) اس لئے وہ پبلک کمیشن جسے ہم نے
تحقیقاتی کمیشن کہا تھا اس کے دائرہ اختیار میں یہ مسائل لائے
جا سکتے ہیں۔ ہاں طرفین کو رواداری اور حوصلے سے مسائل
کو سوچنا ہوگا۔ اس وقت ملک میں اگر نظام مصطفیٰ نافذ نہ
ہو سکا اور محض اس وجہ سے یہ تحریک دم توڑ گئی تو علماء ہی

اور دو قومی نظریے کے خلاف گاندھی، نہرو اور غفار خان کے
ہمنوا رہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی بریلوی دیوبندی دو
مختلف سیاسی دھڑوں میں بٹے رہے سوائے تحریک ختم نبوت
۱۹۵۳ء، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء اور تحریک نظام مصطفیٰ۔
مگر یہ بھی جسموں کا اتحاد تھا، دلوں کا اتحاد نہیں تھا نہ ہے
اس وقت پاکستان تاریخ کے نازک ترین لمحات تک پہنچ
چکا ہے لیکن ان اکابر اور زعماء نے تاحال کسی واضح اتحاد
کی طرف قدم نہیں اٹھایا۔ یہی سیاسی بُعد ہے جس میں دونوں
مکاتب فکر کے ذمہ دار حضرات کو علماء کنونشن میں بھی اکٹھے نہیں
ہونے دیا۔ علماء کنونشن میں مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا
عبد الستار خان نیازی، مولانا احمد سعید کاظمی، مولانا عبد
المصطفیٰ ازہری، مولانا عطا محمد بندیالوی، مولانا نور اللہ بصیر
پوری اور مولانا ابو داؤد محمد صادق وغیرہ بریلوی، اور مولانا
مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبد اللہ درخواستی
وغیرہ اکابر دیوبند علماء شریک نہیں ہوئے وجہ یہی ہے کہ
دونوں طبقے ایک دوسرے کے سیاسی ضد رہے ہیں۔
پاکستان قومی اتحاد کا آخری دور اسی سیاسی لڑائی کا شکار
ہو کر رہ گیا۔ اس لئے کامل اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ جتنا
اس سیاسی بُعد کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ میری تجویز اس
سلسلے میں یہ ہوگی کہ صدر مملکت دونوں گروپوں کے رہنماؤں
کا ایک مشترکہ اجلاس بلا کر اس پر افہام و تفہیم کی کوئی
سبیل پیدا کریں۔

دوسرا اختلاف ہے اعتقادی۔ اس اعتقادی اختلاف
کے اثرات نے ہی دونوں گروپوں کو کسی مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم پر
آنے سے روکا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دیوبندی
مکتب فکر کے قائد مولانا مفتی محمود بریلویوں کے مشہور مدرسہ
جامعہ نظامیہ لاہور میں اس وقت کی جمعیت علمائے پاکستان
کے صدر مولانا عبد الغفور ہزاروی کے پاس مولانا بادشاہ گل
اور مولانا محمد علی جالندھری کی معیت میں پہنچے اور سیاسی
اتحاد کی بات چیت کی۔ چنانچہ مولانا ہزاروی مرحوم نے سیاسی
اتحاد کی تائید کرتے ہوئے اعتقادی معاملات بھی سلجھانے کی
پیشکش کی اور تجویز کیا کہ بریلوی اور دیوبندی مکاتب خیال کے
درمیان جو بنیادی اختلافات ہیں اس پر جانبین سے تین تین
رکنی دو کمیٹیاں تشکیل دی جائیں۔ مفتی صاحب نے تائید کی اور
مولانا ہزاروی نے اپنی طرف سے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی جو
مولانا عبد القیوم ہزاروی، مولانا قاضی عبد النبی کوکب اور مولانا
احمد علی قصوری پر مشتمل تھی کہ نام مولانا مفتی محمود کو دے گئے
مفتی صاحب نے دوسری صبح کو اپنے نام بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن
وہ صبح آج تک طلوع نہیں ہوئی۔ بجائے اس کے کہ ان دونوں کا
معاملہ سلجھایا جاتا مفتی صاحب نے بشیر بختیار صاحب کی
نیم کمیونسٹ لیبر پارٹی سے اتحاد کر لیا اور ۱۱۳ علماء کے سوشلزم
کے خلاف فتویٰ پر بھی مخالفانہ طرز عمل اختیار کیا۔ اندریں حالات
تاثر ہے کہ جب تک جانبین کا اعتقادی بُعد دور نہ ہوگا محض
جسموں کا نمائشی اتحاد مستقبل میں بھی نظام مصطفیٰ کی تحریک
کو سبوتاژ کر سکتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ اختلافات
دو قسموں پر مشتمل ہیں (۱) اصولی (۲) فروعی۔ اصولی اختلافات
کی نشاندہی تو بریلوی علماء یہ کرتے ہیں کہ دیوبند کے اکابر کی
کتابیں حفظ الایمان مصنفہ مولانا اشرف علی تھانوی، تحذیر الناس
مصنفہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور براہین قاطعہ مصنفہ مولانا
خلیل احمد انبیٹھوی وغیرہ کی وہ چند عبارات ہیں جن میں ان کے

خیال کے مطابق ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سوئے ادبی پائی جاتی ہے۔ جبکہ دیوبندی علماء انکی تاویل فرماتے ہیں اسی پر آغا شورش کاشمیری نے غالباً ۱۹۶۲ء میں تجویز پیش کی تھی کہ دیوبندیوں کی طرف سے مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، علامہ خالد محمود اور مولانا عبداللہ درخواستی ہوں اور دوسری طرف سے جو حضرات بھی چاہیں ایک پبلک مقام پر بحث کریں اور فیصلہ عوام (؟) کے ہاتھ میں دے دیا جائے اس پر بریلوی علماء نے پرجوش تائید کا اعلان کیا لیکن دیوبندی علماء نے اس تجویز کو گول کر دیا تاحال اس اصولی اور بنیادی مسئلے کا حل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ اب اگر صدر صاحب یہ کارخیر انجام دے دیں تو یہ انکی بہت بڑی نیکی ہوگی

اس سلسلہ میں جناب صدر کی خدمت میں یہ تجویز عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ قضیئے کو نمٹانے کیلئے دو کمیشن قائم کئے جائیں ایک تحقیقی دوسرا عدالتی۔ تحقیقاتی کمیشن کے ذمے یہ فرض سونپا جائے کہ وہ اس بات کی چھان بین کرے کہ کونسے گروہ کے عقائد اور نظریات برصغیر میں برطانوی استعمار کے آنے کے بعد پیدا ہوئے۔ کیونکہ ہندوستان میں اسلام محمد بن قاسم کے ذریعے پہنچا اور آخری مسلمان تاجدار بہادر شاہ ظفر تک اس عرصہ میں تمام اولیاء صلحاء اکابر اسلام نے ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے ان کے عقائد رسومات اور نظریات خالص اسلام کے ترجمان ہیں۔ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلے مسلمانوں میں اعتقادی بحران پیدا کیا۔ اس لئے اس بات کی چھان پھٹک ضروری ہے کہ کونسے گروہ کے نظریات انگریزوں کے آنے سے پہلے کے ہیں اور کس کے برطانوی سامراج کے تسلط کے بعد کے۔ جس گروہ کے نظریات عقائد اور رسومات برطانوی استعمار کی خون آشامی کے بعد کی پیداوار ہوں ان پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے نیز اس گروہ کو بلا خوف لومۃ لائم برطانوی استعمار کا خودکاشتہ پودا قرار دیا جائے۔ اور اس کی تمام سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ اور دوسرا کمیشن عدالتی ہو (جس کو کم از کم تین ممتاز ججوں کی رہنمائی حاصل ہو) قائم کیا جائے۔ میری تجویز یہ ہوگی کہ جناب جسٹس کارنیلیس، جناب جسٹس کیکاؤس اور جناب جسٹس جاوید اقبال پر مشتمل ہو۔ اس کمیشن میں علمائے دیوبند کی وہ عبارات جن کی نشاندہی علمائے بریلی کرتے ہیں پیش کی جائیں اور جانبین سے کم از کم سات سات وہ علماء پیش ہوں جو اپنے اپنے موقف کا بھرپور دفاع کریں اور انہیں اپنی اپنی پسند کے ممتاز وکلاء پیش کرنے کی سہولت حاصل ہو جس کے جملہ اخراجات حکومت پاکستان برداشت کرے۔ اور اس کا عرصۂ تحقیق زیادہ سے زیادہ تین ماہ مقرر کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ جانبین کے علماء اس تجویز پر چیں بجبیں نہیں ہونگے۔ کہ ہمیں جج صاحبان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے مجھے خطرہ علمائے دیوبند کی مخالفت کا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل یہ تجویز میں نے ملتان کے ایک اخبار کے ذریعے دی تھی اس کی تائید میں علمائے بریلی نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جبکہ علمائے دیوبند نے اس تجویز کی مخالفت کی

میں کسی فرقہ دارانہ جنگ میں الجھے بغیر ایک مخلص محب وطن پاکستانی اور تحریک نظام مصطفیٰ کے ایک کارکن کی حیثیت سے جانبین کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ

اس کے ذمہ دار ہونگے۔ حکومت پاکستان اور صدر مملکت سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ مستحکم اور جرأت مندانہ اقدام کر کے ان تجاویز پر غور فرمائیں۔ میں یقین محکم رکھتا ہوں کہ میری یہ تجاویز اگر بارپا سکیں تو ملک نظام مصطفیٰ کی رعنائیوں سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ ہاں میری یہ تجاویز حرف آخر یا صحیفۂ آسمانی نہیں اہل علم و دانش اس سے بہتر تجاویز بھی لا سکتے ہیں اور لانی چاہئیں وطن عزیز کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے

وما علینا الا البلاغ

(بشکریہ "افق کراچی")

بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں

(حالی)

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر نہ باقی نہ غنا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس ہے سو گدا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
بیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم قضا ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

ثنائے خواجہ

حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمدؐ است
آرے کلام حق بزبان محمدؐ است

آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکارہ ز شانِ محمدؐ است

ہر کس بقسم بآنچہ عزیز است می خورد
سوگند کردگار بجانِ محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

—X—

اسوۂ حسنہ

میدانِ جہاد میں پیغمبرانہ جلال کا ایک روحانی منظر

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہادِ اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے اس لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہمیں اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادے سے میدانِ جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرنا و برق کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں۔ سر پر پرچم لہراتا ہے چترِ شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اسکی طرف نگاہ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدانِ جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا کر دیا جاتا ہے اور تمام فوج اس بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعتاً مرعوب کر دیتا ہے۔ اور اس رعب و داب کے احساس سے اس دنیوی فاتح کا سر بادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خاک و خون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا۔ اگر کوئی اس سرِ پر غرور کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدا بلند ہوتی ہے

زمیں را منم تاج و تارک نشیں
مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین مومنین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے مگر وہ اپنا رفیقِ سفر صرف اللہ کو بناتا ہے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سافر قال اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل اللھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر وکآبۃ المنقلب وسوء المنظر فی الاھل والمال اللھم اطوِ لنا الارض وھوّن علینا السفر۔

"حضور اکرمؐ جب بغرضِ جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے الٰہی تو ہی ہمارا رفیقِ سفر ہے۔ تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائم مقام ہے۔ الٰہی سفر کے شدائد اور پلٹ کر اہل و عیال کو برے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ الٰہی! مسافت سفر کو کم کر دے اور ہمارے لئے آسان بنا دے"

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے

سبحٰن الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین

"کیا پاک و برتر ہے وہ اللہ جس نے اس جانور کو ہمارا فرماں بردار بنا دیا ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے"

وہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں اللہ کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون

"ہم توبہ کرتے ہوئے لوٹتے ہیں۔ ہم اللہ کے عبادت گزار بندے ہیں۔ اور ہم اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے فوج کو روانہ کرتا ہے تو اس کو طاقت کا غرور یاد دلاتا ہے۔ نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا نہ قدیم کارنامہائے شجاعت کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو گرماتا ہے۔ بلکہ اس کے دین کو اس کی امانت کو اس کے تمام نتائجِ اعمال کو اللہ کے سپرد

کر کے رخصت کر دیتا ہے

استودع اللہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم

" میں تمہارے دین تمہاری امانت اور نتائج اعمال کو اللہ کے سپرد کر کے تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے بھیجتا ہوں۔

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لئے خیمے قائم کئے جاتے ہیں نہ فرش و بساط شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا تشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ اللہ کا نام لے کر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سپرد کر دیتا ہے۔

یا ارض ربی وربک اللہ اعوذ باللہ من شرک وشر ما فیک ومن شر ما یدب علیک۔

" اے زمین! میرا اور تیرا رب ایک ہی ہے میں تیرے شر سے تیری سطح باطن کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں "

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اسے اللہ کا گھر یاد آتا ہے۔ اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔ جب اسے فتح و ظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ نہ جشن شاہانہ کی تیاری کی جاتی ہے نہ عیش و طرب کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے رب کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور سجدہ شکر بجا لاتا ہے۔ اس کو جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا۔ بلکہ اللہ ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی فوج کو اللہ کی فوج یقین کرتا ہے۔

کان یقول یوم احد اللھم انک ان تشاء لا تعبد فی الارض

" آپؐ معرکۂ احد کے دن کہتے تھے الٰہی! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو۔

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت کو دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دست سوال نہیں پھیلاتا۔

لما کان یوم بدر نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی المشرکین وھم الف واصحابہ ثلثمائۃ وتسعۃ عشر رجلا فاستقبل القبلۃ ثم مد یدیہ فجعل یھتف بربہ اللھم انجز لی ما وعدتنی اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض فما زال یھتف بربہ مادیدیہ مستقبل القبلۃ حتی سقط ردائہ عن منکبیہ فاتاہ ابوبکر فاخذ ردائہ فالقاہ علی منکبیہ ثم التزمہ من ورائہ وقال یا نبی اللہ کفاک مناشدتک ربک فانہ سینجز لک ما وعدک (مسلم)

" بدر کے دن جب آنحضرتؐ نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپکو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ رو بقبلہ ہو گئے اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دعا شروع کی الٰہی! تو نے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر۔ الٰہی اگر مسلمانوں کا یہ مختصر گروہ فنا ہو گیا تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ آپ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر مسلسل پکارتے رہے یہاں تک کہ جوش استغراق میں دوش مبارک سے چادر گر گئی حضرت ابوبکرؓ نے

آپؐ کے تضرع کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھا کر آپؐ کے کاندھے پر ڈال دی اور آپؐ سے لپٹ گئے اور کہا یا رسول اللہ! آپ اپنی مناجات ختم کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ آپ سے کیا ہے اس کو بہت جلد پورا کریگا"

میدان جنگ میں اللہ کے رسول کو شدید زخم لگتا ہے تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (مسلم)

"الٰہی! میری قوم کو معاف فرما کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں پہچانتے"

قصہ مختصر ایک فاتح میدان جنگ میں سر پر غرور مگر ایک پیغمبر جبین نیاز ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں زبانِ خود ستا مگر ایک داعیٔ حق زبانِ شکر سنج ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں غیظ و غضب کا آتشکدہ مگر ایک منادِ توحید رحم و کرم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے سر پر غرور بار بار ٹھکرا دئے گئے لیکن کسی مؤید من اللہ کی جبینِ نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبانِ خود ستا بار بار ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی لیکن کسی داعیٔ الٰہی کا نغمۂ حمد و شکر کبھی بھی بیچ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بار بار بجھا دئے گئے۔ مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہ روک سکے

(الہلال)

سنت کی تقلید کے علاوہ عبادتیں معتبر نہیں

(مکتوبات امام ربانیؒ)

نعت

کھنچا جاتا ہے دل سوئے حرم پوشیدہ پوشیدہ
تصور میں قدم بڑھنے لگے لغزیدہ لغزیدہ

وہ شیرینی ہے نام پاک کے مبہم مشدد میں
کہ رہ جاتے ہیں دونوں لب بہم چسپیدہ چسپیدہ

حقیقت کیا مگر؟ فرش بیاض دیدہ کی غافل
ملائک پر بچھاتے ہوں جہاں لرزیدہ لرزیدہ

لب اعجاز حضرت کی ہیں گویا دونوں تصویریں
تبسم ریز یہ کلیاں وہ گل خندیدہ خندیدہ

تعالی اللہ پاس خاطر عشاق ہے ان کو
ہے تن پر خلعت شاہنشہی بوسیدہ بوسیدہ

نہوں کیوں کیف آور نزہتیں فردوس اعلیٰ کی
اڑا لائی ہے طیبہ سے صبا دزدیدہ دزدیدہ

کرنگی ظلمت عصیاں سے نور مغفرت پیدا
یہ پلکیں آپکی شام و سحر نم دیدہ نم دیدہ

یہی دیوانگی فرزانگی کا رنگ لائے گی
کہ طیبہ جائیگی میت مری رقصیدہ رقصیدہ

وہ عبس کی جستجو میں عرش اعظم بھی ہے سرگرداں
اسے ٹوٹے دلوں نے پالیا پوشیدہ پوشیدہ

شب اسری کی دولھا کی ضیا باری کا صدقہ ہے
کہ ہیں شام و سحر شمس و قمر رخشیدہ رخشیدہ

نسیم زار کو دیکھا تو ہوگا تو نے بھی ہمدم
پڑا رہتا ہے دیوانہ سا کچھ سنجیدہ سنجیدہ

نسیم شاہجہانپوری

مجلسِ ذکر (سلسلہ اویسیہ نقشبندیہ)

شہر	دن	مقام	وقت
لاہور	پہلا جمعہ	مسجد نور، دارد غہ والا، واہگہ روڈ	۸ ½ سے ۱۰ ½ بجے صبح
راولپنڈی	آخری جمعہ	ہلال مسجد بالمقابل گورنمنٹ سنٹرل ہسپتال سیٹلائٹ ٹاؤن	بعد نماز جمعہ
اسلام آباد	آخری جمعرات	مسجد الفقراء۔ آب پارہ	بعد نماز مغرب
میانوالی	دوسرا جمعہ	صوفی شفاخانہ، بلوخیل روڈ	قبل نماز جمعہ
گجرات	آخری جمعہ	کوٹھی امان اللہ لک صاحب کچہری روڈ	۱۱ سے ۱۲ بجے دن
شاہ کوٹ (شیخوپورہ)	آخری جمعہ	جامع مسجد غلہ منڈی، شاہ کوٹ	بعد نماز جمعہ
سیالکوٹ	پہلا جمعہ	۱/۱۲۲ قائداعظم کچہری روڈ، سیالکوٹ چھاؤنی	۱۰ بجے دن
فیصل آباد	پہلا جمعہ	گلی نمبر ۶، محمد آباد	۹ سے ۱۱ بجے
ملتان	تیسرا جمعہ	سٹیشن ہیڈ کوارٹر، مسجد چھاؤنی	بعد جمعہ
اٹک	ہفتہ	مسجد گورنمنٹ کالج	بعد مغرب
پشاور	تیسرا جمعہ	مسجد کمپنی باغ پشاور	۹ سے ۱۲ بجے دن
ڈیرہ اسماعیل خان	دوسرا بدھ	جامع مسجد کلاں	بعد نماز مغرب
کوہاٹ	آخری جمعہ	عسکری مسجد چھاؤنی	۹ سے ۱۰ بجے
مظفر آباد (آزاد کشمیر)	پہلی جمعرات	سول سیکرٹریٹ جامع مسجد	بعد نماز مغرب
سرگودھا	تیسرا جمعہ	مسجد، بلاک نمبر ۷	۹ ½ سے ۱۰ ½ بجے صبح

گلہائے عقیدت

احمد مجتبیٰ کا جو دل سے غلام ہوگیا
شعلۂ آتشِ جہنم اُس پہ حرام ہوگیا

میرے نبیؐ کا حرف حرف حق کا پیغام ہوگیا
راہِ عمل میں ہر قدم نقشِ دوام ہوگیا

ظلمتِ کفر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی دہر میں
حسنِ محمدی سے آج نور تمام ہوگیا

بزمِ جہاں سے اُٹھ گیا جو محبِ مصطفےٰؐ
عشقِ نبیؐ سے خلدِ مقام ہوگیا

فکر و بیان پہ جب پڑا عکسِ جمالِ مصطفےٰؐ
اور بھی کچھ حسین تر رنگِ کلام ہوگیا

زاہد بے نوا پہ ہے فیض یہ شہرِ علم کا
مدح و ثناء کی بزم میں اس کا جو نام ہوگیا

زاہد فتح پوری

تیرے فیضاں سے ہے قریہ ہستی کو ثبات
ساری دُنیا سے تری سارا زمانہ تیرا

بزمِ امکاں کو ملا تیری تجلّی سے فروغ
جلوہ پیدا ہے ترا، نقش ہویدا تیرا

کس عبارت سے کریں تیرے شمائل کا بیان
کون لکھ سکتا ہے لفظوں میں سراپا تیرا

تُو نے انسان کو دیا معنیٔ انسان کا جمال
کس پہ احسان نہیں ہے شہِ والا تیرا

کیسے خوش بخت تھے وہ کیسے نصیبوں والے
دیکھ پائے جو کھلی آنکھ سے چہرا تیرا

آج بھی تیری توجہ سے ہے دُنیا روشن
صبحِ تخلیق میں بھی نور تھا سارا تیرا

کوکبِ قسمتِ اسلم کی بلندی ہے یہی
بزمِ مدحت میں جو پڑھتا ہے قصیدہ تیرا

اسلم انصاری

نعت

قطرہ مانگے جو کوئی تو اُسے دریا دے دے
مجھ کو کچھ اور نہ دے اپنی تمنّا دے دے
میں تو تجھ سے فقط اک نقشِ کفِ پا چاہوں
تو جو چاہے تو مجھے جنّتِ ماوا دے دے
میں اس اعزاز کے لائق تو نہیں ہوں لیکن
مجھ کو ہمسائیگی گنبدِ خضرا دے دے
یوں تو جب چاہوں میں تیرا رُخِ زیبا دیکھوں
عرض یہ ہے کہ مجھے اذنِ تماشہ دے دے
وہ جو آسودگی چاہیں اُنہیں آسودہ کر
بے قراری کی لطافت مجھے تنہا دے دے
تب سمیٹوں میں ترے ابرِ کرم کے موتی
میرے دامن کو جو تو وسعتِ صحرا دے دے
تیری رحمت کا اعجاز نہیں تو کیا ہے
قدم اٹھیں تو زمانہ مجھے رستہ دے دے
وہ بھی دیکھیں پسِ ہر حرف تری جلوہ گری
سب کو تو میری طرح دیدۂ بینا دے دے
جب بھی تھک جائے محبت کی مسافت میں ندیم
تب ترا حسن بڑھے اور سنبھالا دے دے

○

احمد ندیم قاسمی

پائی ہیں تمدّن نے ضیائیں ترے در سے
روشن ہیں ترے فیض سے تاریخ کے اوراق
بے مایہ ہے سب کچھ ترے ارشاد کے آگے
وہ دانشِ افرنگ ہو یا حکمتِ اشراق
بس تو ہے فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا کا مخاطب
پیرو ہیں ترے آیتِ اَعْلَوْنَ کے مصداق
انوار ترے ظلمتِ دوراں کا مداوا
تذکار ترا ہر سمِ عصیاں کو ہے تریاق
اللہ کی بیعت ہے ترے ہاتھ پہ بیعت
تیرے ہی اشارے پہ ہے تقدیر کا اطلاق
تیری ہی طرف سارے زمانے کی نظر ہے
تو مرکزِ افکار ہے تو محورِ اشواق
تخلیق کا شہکار تری ذاتِ گرامی
ہر نقش ترا شاہدِ یکتائیِ خلاق

○

حفیظ تائب

حاجی حبیب الرحمٰن ریٹائرڈ ایس پی

دعوتِ اسلام

دورِ حاضر میں نوعِ انسانی کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہر طرف مادیت ہی کا دور دورہ ہے۔ آج کی نام نہاد ترقی یافتہ قوموں کے پیشِ نظر انسان کی صرف مادی فلاح ہے۔ کمیونسٹ تو سرے سے کسی مذہبی یا اخلاقی نظریہ کے قائل ہی نہیں، اور جہاں تک یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے ان کا بھی اب مذہب سے برائے نام ہی تعلق باقی رہ گیا ہے۔ وہ کفار کے ایک عقیدہ کی بنا پر روزِ قیامت اپنے اعمال کی جوابدہی کے احساس سے تقریباً فارغ ہو چکے ہیں ان کے کروڑوں عوام کی انفرادی زندگیاں اور اُن کے معاشرے کے اجتماعی معاملات پر خدائی تعلیمات کا ذرہ بھر اثر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ آج شترِ بے مہار کی طرح جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ خود غرضی منافقت معاہدوں اور قوانین میں من مانی تاویل، کمزور قوتوں کی لوٹ کھسوٹ۔ ساری دنیا میں سازشیں کرنا اور حکومتوں کے تختے اُلٹنا اُن کے نزدیک نہ کوئی اخلاقی جرم ہے اور نہ کوئی ظالمانہ فعل۔ بلکہ وہ تو قومی مفاد کی آڑ لے کر خود ہی سب کچھ جائز قرار دے لیتے ہیں۔

اس کے برعکس، اسلام پورے خلوص سے پوری نوعِ انسانی کی فلاح چاہتا ہے۔ اسلامی نظام سے افراد اور معاشرے دونوں کی تقدیریں بنتی اور نکھرتی ہیں۔ کیونکہ اسلام صرف چند عقائد یا مسائل کا مجموعہ نہیں ہے اور نہ ہی ایک ایسا دین ہے جس پر جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر عمل کیا جاتا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا سچا دین ہے۔ یہ تو ایک طریقۂ زندگی ہے اور ایک مکمل اور متوازن ضابطۂ حیات جو فطرت کے بھی عین مطابق ہے۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس دین کو پوری نوعِ انسانی کے لئے پسند فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ رب العلمین ہے۔

"اور میں نے تمہارے لئے دینِ اسلام پسند کر لیا ہے" (سورہ المائدہ آیۃ ۳)

اس دین کی یہ نمایاں خاصیت ہے کہ یہ مسجد سے لے کر ایوانِ حکومت تک اور درس گاہوں سے لے کر تجارتی اداروں تک، ہر شعبۂ زندگی کی رہنمائی اور نگہداشت کی صلاحیت رکھتا ہے

اسلام انسانی زندگی کے آغاز ہی سے نافذ ہے

دراصل اسلام کوئی نیا دین نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے

آغاز ہی سے نافذ ہے۔ تمام انبیاء کرام، دین اسلام ہی کی دعوت دیتے رہے جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا، جس کا اُس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا، اور جس کو ہم نے آپ کے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"

(سورۃ الشوریٰ آیۃ ۱۳)

قرآن حکیم میں دین اسلام کی بعض دیگر خصوصیات کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے جن میں سے چند یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

اسلام دین کامل ہے

"تمہارے دین کو میں نے (اللہ تعالیٰ نے) کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی"

(سورۃ المائدہ آیۃ ۳)

اسلام اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے

"اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ پس تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے جدا کر دیں گے (اس لئے) یہی حکم اُس نے تم کو دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ"

(سورۃ الانعام آیۃ ۱۵۳)

یہی دین تمام دینوں پر غالب ہوگا۔

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا، اگرچہ کافر کیسے ہی ناخوش کیوں نہ ہوں۔ وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اس نور کو پورا کرنے کے لئے) اپنے رسولؐ کو ہدایت (قرآن کریم) اور سچا دین (دین اسلام) دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکین کو کیسا ہی بُرا کیوں نہ لگے۔

(سورۃ الصف آیۃ ۸/۹)

ہدایت کا واحد ذریعہ دین اسلام ہے

"سو اگر وہ (مشرکین و کفار) بھی اسی طریق پر ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب وہ بھی ہدایت پر آ گئے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ (تو پہلے ہی) ہٹ دھرمی پر ہیں۔

(سورۃ البقرہ آیۃ ۱۳۷)

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اسلام لانے کے لئے بلایا جائے لیکن وہ اللہ پر (اُلٹا) جھوٹا طوفان باندھے اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا"

(سورۃ الصف آیۃ ۷)

اسلام سے بدظن کرنے کی ممانعت

ارشاد فرمایا۔ "سن لو کہ ایسے ظالموں پر اللہ کی لعنت

ہوگی جو کہ دوسروں کو بھی اللہ کے راستہ (دینِ اسلام) سے روکتے تھے۔ اور اس میں کجی (اور شبہات) نکالنے کی تلاش میں رہا کرتے تھے تاکہ دوسروں کو (بھی) گمراہ کریں۔"

(سورۃ ہود آیۃ ۱۸ تا ۱۹)

ایسوں کو اوروں کے مقابلہ میں دوگنی سزا دی جائے گی۔

(سورۃ ہود آیۃ ۲۰)

دعوتِ اسلام دینا بہترین عمل ہے

سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔

"اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) اللہ (کے دین) کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں (اللہ کے) فرمانبردار (بندوں میں سے) ہوں (یعنی سچا مسلمان)" (سورہ حٰمٓ السجدہ آیۃ ۳۳)

دینِ اسلام اختیار کرنے کا حکم

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدموں پر مت چلو۔ واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" (سورۃ البقرہ آیۃ ۲۰۸)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا

"سو آپ سب سے منہ موڑ کر اپنا رُخ اس دین (اسلام) کی طرف رکھیں جو عین فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔"

(سورۃ الروم۔ آیۃ ۳۰)

دینِ اسلام اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں

(اے نبیؐ) یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی، بشرطیکہ تم سچے ہو۔ (سورۃ الحجرات آیۃ ۱۷)

قرآن کریم کے ذریعہ نصیحت کرنے کا حکم

"اور اس قرآن کے ذریعہ سے نصیحت بھی کرتے رہیئے تاکہ (کہیں ایسا نہ ہو کہ) کوئی شخص اپنے کئے کے سبب کسی ایسی مصیبت میں نہ پھنس جائے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی اس کا مددگار ہو اور نہ سفارشی۔" (سورۃ الانعام آیۃ ۷۰)

اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے کا حکم

ارشاد فرمایا "اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ۔ جیسا کہ عیسیٰؑ بن مریم نے (ان) حواریوں سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے۔ وہ حواری بولے کہ ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں۔ سو (اس کوشش کے بعد) بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ منکر ہو گئے سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی۔ سو وہ غالب ہو گئے۔" (سورۃ الصف آیۃ ۱۴)

دعوتِ اسلام قبول نہ کرنے والوں کو خسارہ

ایسے لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ

"اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے (دنیا میں) تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے۔ وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ ایسے ہی تیرے پاس ہمارے احکام پہنچے تھے۔ پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا (بھی) کچھ خیال نہ کیا جائے گا۔" (سورۃ طٰہٰ آیۃ ۱۲۴ تا ۱۲۶)

دین کی دعوت دانائی کے ساتھ دی جائے

ارشادِ حق تعالیٰ ہے۔ "اپنے رب کے راستہ (یعنی اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور ایسی نصیحت سے دعوت دیجئے جو اچھی ہو اور ان کے ساتھ ایسے طریقہ سے بحث کیجئے جو اچھا ہو۔ (سورۃ النحل آیۃ ۱۲۵)

دین کی دعوت دینے کیلئے سخت جدوجہد کی ضرورت

تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کی دعوت دینے والوں کو شدید ترین مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ محض زبانی وعظ و تبلیغ سے نہیں پھیلا۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ذکر فرمایا کہ اس کے برگزیدہ بندوں نے طرح طرح کی جان لیوا سختیاں جھیلیں۔ اس کے پیغمبروں کو قید خانوں اور آگ کے شعلوں میں ڈالا گیا اور کبھی آرے چلا کر جسم کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ لیکن وہ ایسے باہمت تھے کہ انہوں نے ان سخت آزمائشوں کے باوجود، باطل کا ہر محاذ پر مقابلہ کیا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف کوئی خود ساختہ نظریہ یا عقیدہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حق کی آواز بلند کرنے کے لئے ہمیشہ بڑی استقامت اور صبر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا آج کے گمراہ کُن اور ملحدانہ دور میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ غیر اسلامی نظریات سے وقتی مصلحتوں کی بنا پر کسی قسم کی بھی مصالحت نہ کی جائے کیونکہ یہ کوئی مقامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ آیئے ہم سب وعدہ کریں کہ ہم غیر اسلامی عقائد اور نظریات کا ہر سطح پر ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ بالآخر دین اسلام ہی غالب ہو کر رہے گا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

"اور آپ کہہ دیجئے کہ حق (دین اسلام) آگیا اور باطل پاش پاش ہو گیا۔" (سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۸۱)

یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم پوری کوشش کریں کہ انسان کے ہاتھوں انسانیت خاک میں ہرگز نہ ملنے پائے۔ یہ وہی فرض ہے جس کے لئے ہمارے نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔

رحمت اللعلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود فرمایا۔

"میری اس دعوت و ہدایت کی مثال جس کے ساتھ مجھے دنیا میں بھیجا گیا ہے ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی، جب اس کی روشنی گرد و پیش میں پھیلی تو وہ پروانے اور کیڑے جو آگ پر گرا کرتے ہیں، ہر طرف سے امنڈ کر اس

میں کودنے لگے۔ اسی طرح تم آگ میں گرنا اور کودنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ کر اس سے بچاتا ہوں اور علیحدہ کرتا ہوں۔

(بخاری شریف)

اس سلسلہ میں کوتاہی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنی چاہیئے۔

"کہدیجئے۔ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کھاتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو خدا اور اُس کے رسولؐ سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

اختر انصاری اکبر آبادی

نعت

جلوے سے تمہارے ہے جہاں آئینہ ساماں
اِک عالمِ انوار ہے اور دیدۂ حیراں
ہر سمت اشارے ہیں نگاہوں کے تمہاری
گلزار نظر آتے ہیں اب دشت و بیاباں
تابندگی و تازگی عشق کے باعث
دُنیائے محبت ہے گلستاں ہی گلستاں
اُمّی نے کیا علم سے ہر دور کو روشن
دنیا میں مشہور ہے مدینے کا دبستاں

مطلوبِ نظر صرف تمہیں تم ہو جہاں
ہاں تم ہی محبت میں ہو مقصودِ دل و جاں
ہے گیسوؤں والے کی تجلّی جو نظر میں
اب آہ لبوں پر ہے نہ اب دل ہے پریشاں
اِک حُسن کا جلوہ ہے جو مرکز ہے نظر کا
اک نور ہے دنیا میں جو ہر سمت ہے رقصاں
اُن سے ہی محبت کر و اختؔر کہ محبت
ہر غم کا مداوا ہے ہر اک درد کا درماں

سول ایجنٹ: مدنی کتب خانہ گنپت روڈ، لاہور